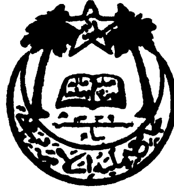
رجسٹرڈ نمبر ڈی-۱۸۹۲



جامعہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

قیمت سالانہ صہ/ مطبع جامعہ دہلی فی پرچہ ۸/

اُردو اکادمی

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی

مندرجہ ذیل کتابیں حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ اراکینِ اردو اکادمی اپنے حساب میں طلب فرما سکتے ہیں :۔

ترجمانُ القرآن (جلد دوم) از مولانا ابو الکلام صاحب آزاد

قیمت بلا جلد ۔ مجلد

مختصر تاریخ ہند ۔ از سید ابو ظفر صاحب ندوی ۔ شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ

قیمت عہ

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ۔ از مولوی ابو الحسنات صاحب ندوی مرحوم شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ ۔

قیمت ۱۲ر

مقالاتِ شبلی جلد پنجم ۔ (تاریخی) شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ ۔

قیمت عہ ر

انقلابِ روس ۔ از کشن پرشاد صاحب کول ۔ شائع کردہ ۔ ہندوستانی اکیڈمی ۔ الہ آباد

قیمت ے ر

جوشِ فکر ۔ مجموعہ مضامین سید سلطان حیدر صاحب جوشؔ

قیمت عہ ر

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۶	جون سنہ ۱۹۳۶ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

اس سال کا خوبصورت تحفہ

سال گرہ نمبر ۱۹۳۶ء

پیامِ تعلیم کے سال گرہ نمبر کی تیاری ابھی سے شروع ہو گئی ہے جن بچوں نے پچھلے سالوں کے تاسیس نمبر دیکھے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ خاص نمبر ہم کس اہتمام سے نکالتے ہیں پچھلے تاسیس نمبر ۳۵ء کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہمیں با دلِ ناخواستہ بچوں کی بے شمار درخواستیں واپس اور اخباروں کے ایجنٹوں کی بہت سی فرمائشیں منسوخ کرنا پڑیں۔ اس سال ہمارا تاسیس نمبر اللہ نے چاہا پچھلے سال کے خاص نمبروں سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہو گا۔ اس مرتبہ ہم نے اس کی قیمت ۱۲ر رکھی ہے لیکن خریداروں سے اس کی زائد قیمت نہیں لی جائے گی۔ تم یہ نمبر حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو ابھی سے رسالے کے خریدار ہو جاؤ یا (عہ ر) کے ٹکٹ بھیج دو۔ اس خاص نمبر میں اشتہار بھی چھپ سکتے ہیں لیکن صرف وہی جو بچوں کی دلچسپی اور فائدے سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایجنٹ حضرات کو ابھی سے باخبر رہنا چاہئے۔

مکتبہ جامعہ دہلی

"ماتمِ انصاری"

یہ جوشِ نالۂ غم، یہ نوائے گریہ و زاری ؏ رہے گی چشمِ ملت حشر تک وقفِ گہرباری

قیامت تک وطن کو خون کے آنسو رولائے گی ؏ پئے یارانِ ہمدم آپ کی یہ گرم رفتاری

ضرورت تھی کہ "انصاری" بھی اس محفل میں جا پہنچیں ؏ جہاں تھے بزم آرا خلد میں "یارانِ انصاری"

کہیں ہیں کارفرما "اجمل" و "جوہر" کہیں "شبلی" ؏ وہاں بھی ہے "امیرِ وفد" کے مقدم کی طیاری

بچھیں فرشِ راہ آنکھیں آج ان ترکی شہیدوں کی ؏ کہ جن کی نزع کے عالم میں کی تھی تم نے دلداری

یتیموں اور بیواؤں کے غمخوارانِ رفتہ سے ؏ مگر لینے گئے ہیں آپ دادِ سعیِ غمخواری

سکوں ناآشنا دل درد سے ہر دم تڑپتا تھا ؏ کہ تھے تم آشنائے لذتِ دردِ دلِ افگاری

مریضِ قوم کے حق میں دکھاتی تھی مسیحائی ؏ دمِ عیسیٰ سے بڑھ کر آپ کی وہ نرم گفتاری

گوارا تھا نہ تم کو اس غلام آباد میں جینا ؏ وطن کی اس فضا سے تھی تمھیں از بسکہ بیزاری

بالآخر ہو گئے آزاد تم زندانِ ہستی سے ؏ زمانہ کو دکھا دی مر کے تم نے شانِ خودداری

وداعِ روح تک تڑپا کیا دل دردِ ملت سے ؏ وطن کے غم میں وہ آنکھیں رہا کیں وقفِ خونباری

جہادِ حریت کے آپ وہ تنہا مجاہد تھے ؏ صفِ اعدا کو اب تک یاد ہے جس کی جگرداری

وہ پھونکی روح تم نے قالبِ بے روحِ ملت میں ؏ کہ دوڑی ذرہ ذرہ کی رگوں میں برقِ بیداری

جسے دیکھا مے حبِ وطن سے چور کر ڈالا ؏ مرے ساقی کی چشمِ مست کی اللہ رے سرشاری

ابھی کل تک امیرِ عسکرِ احرارِ ملت تھے ؏ مبارک اب شہیدانِ وطن کی تم کو سرداری

ترے ہی دم سے قائم تھا وقارِ مجلسِ ملی ؏ ترا ہی فیض تھیں خاکِ وطن کی عظمتیں ساری

اسی جنسِ گراں کی تھی طلب پیہم زمانہ کو ؏ تجھی سے تھی متاعِ حریت کی گرم بازاری

قیادت کی قبا بس تیرے قد پر راست آتی تھی ؏ ترے ہی سر پہ زیبا تھی کلاہِ فخرِ مختاری

رہے گی بارِ احساں سے ترے خم گردنِ ملت　　نہ لائے گی کبھی یہ ناتواں تابِ گرانباری
سہے گی جامعہ اب عمر بھر صدمے یتیمی کے　　رہے گی سوگوارِ ماتمِ حبِ نگاہِ انصاری
ودیعت ہے ترے آغوش میں اے خاکِ ملیہ[1]　　شبستانِ وطن کا آفتابِ صبحِ بیداری
نہ پھر چمکے گا یہ، لیکن وطن کے ذرہ ذرہ میں　　رہیں گی اس کی کرنیں حشر تک گرمِ ضیاباری
پیامِ آفریں! اے سرفروشِ مشہدِ ملت　　سلامِ آخریں! اے سرفرازِ رحمتِ باری
وداع اے ساکنِ "دارالسلام" اے عازمِ جنت　　فراق اے طالعِ ہندوستانِ عہدِ بیداری

تمھیں اس دور میں سب چارہ سازِ دردِ ملت تھے
تمھیں اس عہد میں نازِ وطن تھے، فخرِ امت تھے

[1] جامعہ ملیہ۔

شمالی ہندوستان کے دیہات کی زبان

کچھ عرصے سے ہندوستان کا کوئی اخبار یا رسالہ، دفتر یا دکان، کالج یا مدرسہ ایسا نہیں جہاں یہ گفتگو نہ ہو "ہماری اصلی زبان تو ہندی ہے اور مسلمانوں نے ناحق اُردو اُردو کا شور مچا رکھا ہے" یا یہ کہ "ہندوستان" کی زبان سوائے اُردو کے دوسری نہیں ہو سکتی کیونکہ صرف اسی میں مشترکہ زبان (لنگا فرنیکا) کہلانے کی تمام خصوصیتیں اور صلاحیتیں موجود ہیں" وغیرہ وغیرہ جب سے گائے کی قربانی اور مسجدوں کے سامنے باجے بجنے کے سوالات مدہم ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک کے سارے نوجوان پہلوانوں اور سیاسی لڑنت کے چالاک استادوں نے اپنا اکھاڑہ اس نئے میدان میں لا جمایا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس نئے اکھاڑے میں وہ داؤں گیر بھی خم ٹھونک کر اترنا شروع ہو گئے ہیں۔ جو پہلے دنگلوں میں صرف آنکھ کے اشاروں سے کام لیا کرتے تھے۔ ظاہر میں ان کی بھگتی قابل مثال تھی، بات بات پر وہ اتحاد، اتحاد، کے نعرے لگاتے تھے، اور فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والوں پر آوازے کستے تھے ــــ جب اُردو ہندی کا سوال پیدا ہوا، تو ابتداً اس کو کوئی سیاسی سوال نہیں سمجھا گیا تھا۔ ہر شخص اس کو ایک ضروری لسانی مسئلے سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ گو اندر ہی اندر چھریاں چل رہی تھیں۔ مگر کسی نے اس کو وہ نہیں سمجھا جو آج ہر شخص سمجھ رہا ہے، اور اس کے وجوہ بھی ہیں، کہ اس کو وہی سمجھا جائے۔

دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ہندی ملکی زبان ہے۔ درست۔ مگر جب یہ سوال کیا جاتا ہے، کہ وہ زبان جو ہندو ادیب اختیار کرتے جا رہے ہیں، کس حصہ ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ صوبہ آگرہ اودھ صوبہ متوسط کے ایک حصے اور جنوبی پنجاب میں۔ بہت خوب، چلئے یوں ہی سہی۔ لیکن اگر یہ سوال کر لیا جائے، کہ کیوں صاحب اُردو ہندوستان کے کس صوبہ میں نہیں سمجھی جاتی؟، کتنے مدراسی، بنگالی، بہاری، گجراتی، مرہٹے، پنجابی اور سرحدی ہیں، جو اپنی مقامی زبان کے علاوہ اُردو سمجھتے ہیں اور بولتے ہیں، اور اسی طرح کتنے ہیں جو ہندی سمجھتے اور بولتے ہیں؟ تو اس سوال کے جواب

میں یا تو جاہلانہ کج بحثی کی جائے گی، یا دانش مندی سے گفتگو کا رُخ ہی بدل دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر یہ بھی سوال کیا جائے۔ کہ صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ، جنوبی پنجاب اور صوبہ متوسط کے مذکورہ حصے میں جتنے ہندی زبان کے ادیب ہیں۔ جب وہ بات کرتے ہیں، تو کس زبان میں کرتے ہیں؟ اور لکھتے ہیں تو وہ زبان کونسی ہوتی ہے؟ تو اس کے جواب میں بھی آپ کو پچھلا تجربہ دوہرانا پڑے گا۔ کیونکہ اُردو کا تو نام لینا بھی مہا پاپ ہے۔

اُردو زبان کو مٹانے کا جذبہ جن اصحاب کے دلوں میں موجزن ہے۔ اُن کو اقسام ذیل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ وہ سیاسی متعصب ہندو، جو کھلے بندوں اُردو کو اسلامی زبان سمجھ کر اس کو ہندوستان سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس "خدمت" کو وہ اس لئے مستحسن سمجھتے ہیں۔ کہ اُن کے خیال میں اُردو کی جگہ "ہندی" زبان کے اختیار کرنے سے مسلمان، ہندو تہذیب و معاشرت، اور آخر کار مذہب اختیار کر کے ان میں مدغم ہو جائیں گے۔

۲۔ وہ، جو مسلمانوں کی نام نہاد "بین الاقوامی" حیثیت سے خوفزدہ ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ اُن کا تمدنی اور مذہبی تعلق اسلامی دنیا سے قطع ہو جائے۔ جس سے وہ مجبور ہو کر بقول اُن کے "خالص ہندوستانی" بن جائیں۔ یہ گروہ اُردو زبان کی متعصبانہ مذمت تو نہیں کرتا۔ مگر اردو رسم الخط کی خامیوں اور عربی و فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے استعمال کو قابلِ اعتراض قرار دیتا ہے۔ اُردو ادیبوں کے ساتھ مل کر ایک طرف تو مصلحین کے گروہ کے قائم کرنے کا پرچار کرتا ہے۔ اور دوسری طرف کھلے بندوں ہندی تکمیلن قائم کرتا ہے۔ اگر کسی صوبے میں فارسی زبان کی تعلیم ابتدائی بالکل نصاب تعلیم سے خارج کر دی جائے، تو اسے جائز قرار دے سکتا ہے۔ اور اُردو کے خارج کئے جانے کی کوششوں کو بھی غیر مستحسن قرار نہیں دیتا۔ ہاں اگر صوبہ سرحد میں (جہاں ہندی یا گورکھی کا نام و نشان نہیں ہے) ہندی یا گورکھی کے رواج دئے جانے کو روکا جائے، تو اس کے خلاف شدت سے آواز بلند کرتا ہے۔ مسلمانوں کو وہ مشورہ دیتا ہے، کہ "میاں تم مکے و مدینے کا ذکر اپنے مضامین میں کیوں کرتے ہو، ترکی و شام

کے مناظر کی طرف کیوں نظر اٹھا کر دیکھتے ہو۔ گنگا وجمنا کے کناروں اور کشمیر کی وادیوں کے دلفریب نظارے کیا تمہارے لئے کافی نہیں ؟'۔ تم اپنے استعاروں، تشبیہوں اور تمثیلوں میں موسیٰؑ وعیسیٰؑ، علیؓ وحسینؓ قیس ولیلیٰ، شیریں وفرہاد، جیسے غیر ہندی کرداروں کو کیوں پیش کرتے ہو، جبکہ رام، لکشمن، سیتا، کرشن، اور بھرت جیسے کردار موجود ہیں" یہ سب باتیں وہ لوگ کہتے ہیں۔ جو یہ بھی جانتے ہیں، کہ اُردو ادیب خالص ہندو کرداروں سے بھی بے پروائی نہیں برتا کرتے ہیں۔

غرض یہ "احمقانہ"، یا "عکیانہ" فضا ہندوستان پر آج کل طاری ہے، جس میں سے ہم خوشی یا ناخوشی سے گزر رہے ہیں زبان کے متعلق یہ جرح وقدح چونکہ نیک نیتی اور انصاف پسندی پر مبنی نہیں ہے اس لئے کتنی ہی معقول دلیلیں کیوں نہ پیش کی جائیں وہ سب بے اثر رہیں گی۔ لیکن پھر بھی جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچا دینے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحقیقات کی جائے کہ ہندی جس زبان کو کہا جا رہا ہے وہ کہاں بولی جاتی ہے یقیناً ہمارے اس دعویٰ پر ہندی زبان کے کسی ایماندار وکیل کو اعتراض نہ ہوگا کہ صوبہ جات آگرہ واودھ، جنوبی پنجاب اور صوبہ متوسط کے ایک حصہ کے شہروں میں جو زبان بے تکلفی کے ساتھ بولی اور لکھی جاتی ہے اسے آج کل کی ادق کتابی ہندی سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ وہ صاف اور آسان اُردو یا ہندوستانی ہے۔ اس لئے شہروں کی زبان پر بحث کرنے کی بجائے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس علاقے کے دیہات کی زبان کیا ہے اور یہ کہ دیہات اور قصبات کے لوگ جو زبان بولتے ہیں۔ اس زبان میں اور شہری لوگوں کی بول چال، تقریر وتحریر میں وہ کون سے الفاظ، استعارے اور تشبیہیں ہیں جن سے دیہاتی زبان بالکل جداگانہ زبان بن کر اُردو کی بجائے ہندی کہلا سکتی ہے۔

جب یہ تحقیق مقصود ہے کہ مذکورہ حصص ملک کے دیہات میں کیا زبان بولی جاتی ہے۔ تو ہم لامحالہ ملک کے ان حصوں کے گیتوں، منظوم قصوں اور شعرا کے کلام کو تلاش کریں گے کیونکہ اس کے سوائے دوسرا اور کوئی طریقہ زبان کے متعلق جانچ کا نہیں ہوسکتا۔

ان صوبجات میں متعدد منظوم قصے سانگوں اور گیتوں کی صورت میں مروج ہیں، جن میں سے حسب

"نظر" گھوم گئی جب کڑیا کی سامنے ماہل پڑا دکھائے
آؤ چودھری اور سیل والے کہنے لگا کڑنگا رائے
"کرسی" ڈالدی مہلیا کو بیسڑا دیا پان کا لائے
بولا کڑیا جب للکارا اب تم سن لو مہلیا رائے
بہت "دنوں" میں تم آئے ہو ہم کو "حال" دیو بتلائے
کہو "حقیقت" "گڑھ مجے کی کیسے رہے چندیلا رائے
تم نے کہدیا تھا گنگا پر ہم تجھے میں پہنچے جائے
بہت "سپاہی" مرے ہمارے اور وہاں ہار ملا کہیں نائے
بڑے لڑیا وہ پانچوں تھے چھتری گھوڑوں کے "اسوار"[۵۱]
جو نا ہوتے پھاٹک پر چھوڑ تا نہیں نولکھا ہار
لوٹ کرالیتا مجے کی اور راجہ کو دیتا مار
جتن بتا دو اب "جلدی" سے کیسے ملے نولکھا ہار
اس پر "جواب" دیا ماہل نے راجہ مانڈو کے "سردار"
جو تم چاہو ہار نولکھا "لشکر" "جلدی" "کرو" تیار"
کرو "تیاری" تم "جلدی" سے اپنا "لشکر" لیو سجوائے
ایسا جتن تمھیں بتلاؤں سارا "کام" "فتح" ہو جائے
بہت دنوں کا "عرصہ" ہو گیا۔ بوڑھے ہوئے بناپھل رائے
"قلعے" بنا کر چندیلے نے سب کو نیارا دیا بسائے
ایسا "وکت"[۵۲] نہیں ملنے کا کڑیا سن لو کان لگائے

---

۵۱ سوار   ۵۲ وقت

آدھی رات کو چھاپہ مارو "قلعہ" جھپا وٹ گھیر وجائے

اس اقتباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس نہایت مقبول اور مشہور نظم کی زبان کیا ہے ظلم۔ دل۔ قلعہ۔ خبر۔ شعلہ۔ اژدر۔ غصہ۔ بدن۔ تیار۔ منزل۔ داخل۔ نظر۔ کرسی۔ حال حقیقت سپاہی سوار۔ جواب۔ جلدی۔ لشکر۔ فتح۔ وقت۔ ۲۱ الفاظ فارسی وعربی کے ۱۹ اشعار میں آئے ہیں۔ اور ان میں سے بعض الفاظ کئی کئی دفعہ آئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور سینکڑوں خالص عربی فارسی کے الفاظ ملتے ہیں۔ اور بعض جگہ مصرعے کے مصرعے اور پورے اشعار تک انہی لفظوں سے بنائے گئے ہیں مثلاً

"حکم سنایا سرداروں کو لشکر جلد کرو تیار"

"جو کچھ ہاتھ لگا کپڑا کے لاد لیا سارا سامان
یمندی، قلاش، بادلے، کمخواب، اور ریشمی تھان

"نہیں بھروسہ زندگانی کا جانے نکل جائے کب جان"

"حکم دیا سرداروں کو لشکر جلدی لو سجوائے
توپ، بندوق، رفل، رسالا سب سڑکوں پہ دوڑھوائے"

"افسر افسر چڑھے ہاتھی پہ اور گھوڑوں پہ چڑھے سوار"

"گمٹ بندھ گیا رجپوتوں کا کا دہ دستے بھریں سوار
پیدل پلٹن اور رسالے آگے چلے جسے ڑھی بردار"

"ہاتھی بندھ گئے، گھوڑے بندھ گئے، سب نے کھول دھرے ہتھیار
چاروں طرف کو لشکر پڑ گیا، پیدل، پلٹن اور سوار"

مذکورہ بالا اقتباس مثال کے طور پر آلہا کی صرف ایک داستان کے ۵۰ ابتدائی اشعار میں سے دیئے گئے ہیں۔ ساری نظم اسی انداز اور اسی زبان میں ہے۔ ذرا تلاش تو کیجئے کہ ان اشعار میں کتنے لفظ ہیں جن کو اُردو ادیب استعمال نہیں کرتے ہیں۔

ست ساگر

یعنی

پورن بھگت کے قصّے کا پہلا حصّہ

ست ساگر نامی سانگ میں پورنمل بھگت کے قصے کو بیان کیا گیا ہے۔ پورن بھگت نہایت مشہور ہندو کردار ہے۔ اس سانگ کو برج کے علاقے اور اس کے متصل علاقے کے دیہات میں ہر چھوٹا بڑا بہت اشتیاق سے دیکھتا ہے۔ جب سانگیوں کی ٹولی ایک گاؤں سے دوسرے دور و دراز فاصلے کے گاؤں میں جاتی ہے، تو بہت سے شوقین مکرر سانگ دیکھنے کے شوق میں اس طویل فاصلے کو طے کرنے کے لئے سانگیوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں، مصنف چھدا لال ساکن موضع برولی ہے۔ جسے "برج باشی" کہنا ہی زیادہ موزوں ہے۔ سانگوں میں مصنفین غزلیں بھی لکھتے ہیں۔ جن کے لئے وہ "بحرِ طویل" اور "قوالی" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ "قوالی" سے مراد چھوٹی بحر کی غزل سے ہوتی ہے۔ اور "بحر طویل" سے ہر وہ بحر مراد لی گئی ہے۔ جو ذرا بھی چھوٹی سے بڑھ جائے۔ الفاظ "قوالی" و "بحرِ طویل" دونوں قابل غور ہیں۔ تمام سانگ سوال جواب میں ہی ہوتا ہے کہیں کہیں مصنف

راوی کے بیان کو " رنگا چارکا جواب " لکھتا ہے ۔ ناظرین کے ملاحظے کے لئے ست ساگر کے جستہ جستہ اقتباس پیش کئے جاتے ہیں :-

قصے کو شروع کرتے وقت سرخی دی گئی ہے " آغاز داستان " اور پھر نظم یوں شروع ہوتی ہے :-

دوہا

سجن جن یہ " داستاں " نیت دھرم سے " پور "[1]
بست ملک پنجاب اک " دنیا " میں " مشہور "

چوبولہ[2]

" دنیا " میں " مشہور " " حسن " کی جہاں " یکتائی " ہے ۔ دیکھ " نور " " شرمندہ " " حوروں " نے " قسم " کھائی ہے
بہیں پانچ " دریاؤ "[3] کیا ایشور کی پربہوتائی ہے ۔ سیالکوٹ کی چھوٹی سی راجدھانی جہاں کھائی ہے

قوالی

شنک پت مند میں " ظاہر " بیان ان کا سناتا ہوں ۔ پرنم " استاد " اپنے کو " دمبدم " " سر " جھکاتا ہوں
جتی برہم چری پورنل زبت کے ایک لڑکا تھا ۔ نیت دھرم میں پورت چلن کا نیک لڑکا تھا
ایک دن کسم نگری سے تیر آیا سوئمبر کا ۔ چلن کا " قصہ " زبت کینا " ہرش "[4] چھایا سوئمبر کا

دوڑ

بشن ۔ بھوشن ، بھرے تن ، شنک پت خوش ہون میں ، زبت " محلن " میں آئے
دیکھ سجاوٹ رانی انبا دیوی یوں سنائے

---

۱ پُر
۲ چوبولہ یعنی چہار " بول " چہار مصرع
۳ دریا
۴ حرص.

قصے کی ابتدا یوں کی گئی ہے۔ کہ ایک ملک تھا پنجاب جہاں کی راجدھانی سیالکوٹ تھی جس کے باشندوں کا "حسن" "حوروں" کو" شرمندہ" کرتا تھا۔ راجہ کا نام نربیت تھا اور رانی کا اچھا دیوی راجہ صاحب گو خاصی عمر کے تھے، ان کے ایک کنوارا، نیک لڑکا پورنمل بھی تھا۔ مگر تھے ہوس پرست، کسم نگری سے خط آیا کہ وہاں کی راجکماری کا سوئمبر ہے۔ راجہ صاحب بن سنور کر "محل" میں آئے۔ آگے چل کر شاعر کہتا ہے۔ کہ رانی نے کہا "مہاراج کدھر چلے" "نوشہ" بن کر "نوجوان" بن کر "جہاں پناہ" "عجب" "ادا" سے آپ سجے بنے ہیں۔ کیا ارادہ ہے "خاکسار" رانی سے "مہربانی" سے دل کا "حال فرماؤ"۔ راجہ صاحب نے کہا کہ رانی پھولندے کا سوئمبر ہے جس سے دل کو "بے قراری" ہے، چھتری کئی شادیاں کر سکتے ہیں، اسی لئے اس سوئمبر میں جانے کی "تیاری" ہے۔ اب رانی سمجھاتی ہے کہ مہاراج آپ کی عمر شادی کے قابل اب نہیں ہے۔ اور راجہ صاحب رانی کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں:۔

جواب راجہ کا

دوہا

سن لی تیری کہانی بس چپ رکھ "زبان" - لائیں رانی دوسری "دل" میں ٹھانی ٹھان

چوبولہ

دل میں ٹھانی ٹھان رنگ تو اپنا لگی جمانے - کا ئرتا کی آج "نصیحت" ہم کو لگی سنانے
باتیں لگی بنائے مجھے کیوں "غصہ" لگی دلانے - چل ہٹ "بیوی" مو کو تو بوڑھا لگی بتانے

دوڑ

بجائے کیوں گالن کو، نہ مانو تیرے بچن کو، سنی ہے تیری بانی "شاہوں" کا "سرتاج" بنوں بیاہوں پھولندے رانی۔

جواب رانی کا

مانو مانو یران پت، سچ پیاری کی کہن - پھر نشدنی پچھتاؤ گے، ملے نہ پل بھر چین

۔ تمہیں " لازم" سوئمبر نہ جانا پیا

آپ کی "عمر" کیا ہے، "خیال" تو بھر تار کرو ۔ رہی سمجھائے، دو جا بیاہ نہ " سرکار" کرو
کلج نشٹ ہو رہیگی " جاں پناہ" بچار کرو ۔ "فضیحت" ہوئیگی سنسار میں "اعتبار" کرو
ذرا سوچو برا ہے " زمانہ " پیا ۔ تمہیں لازم سوئمبر نہ جانا پیا

" چاہ " کرتے ہو کتنے بیاہ کی تو تاب "نہیں ۔ "وصل" کی " لذتیں " تو تم میں رہیں "جناب" نہیں
"جوانی" "ڈھل گئی"، تن میں رہی کچھ "آب" نہیں ۔ "ستم" "افسوس" ہے "ہر چند" ہو نبھاؤ نہیں
بھول جاؤ گے "عشرت" اڑانا پیا ۔ تمہیں لازم سوئمبر نہ جانا پیا

چھوڑو "خام خیالی" "منتیں" "منظور" کرو ۔ بھجو سری رام کو سندیج سبھی دور کرو
"مہربانی" "خدا" کی "غور" تو "حضور" کرو ۔ بنی ہے بات "طور" "آپ" دور کرو
"خیال" چاہئے بڑھاپے کا لانا پیا ۔ تمہیں لازم سوئمبر نہ جانا پیا

ایک "فرزند" "مثل" "چندر کیا" "درکار" رہی ۔ بسے دس بھوک کی "جرات" "اب تمھارا" رہی
"ضد" کو ٹھان رہے نا کچھ "شمار" رہی ۔ "فانگی" "عمر" کی نہیں پیا بڑھوار رہی
بھاری "رنج و غم" ہوگا اٹھانا پیا ۔ تمہیں لازم سوئمبر نہ جانا پیا

دوڑ

پیا وہ "جوان" آوے ۔ سینگ پر تمھیں کھلا دے ۔ "شان" "شیخی" گھٹ جاوے
"خاندان" "سلطانی" پر تیم " خاک میں ملا دے

آگے رنگا چار (راوی) بیان کرتا ہے کہ رانی نے "ہر چند" سمجھایا۔ مگر راجہ صاحب نہ مانے اور سوئمبر جانا "پسند" کر کے معہ "لشکر" روانہ ہو گئے۔ اور سیالکوٹ کے "سلطان" سوئمبر پہنچ گئے راجہ پھول چکر نے خوب "خاطر داری" کی۔ سوئمبر میں فیصلہ راجہ سیالکوٹ کے حق میں ہوا۔ اور وہ معہ رانی پھولندے اپنی راجدھانی میں آئے۔ جس وقت نئی رانی کی ڈولی "محل" کے دروازے پر پہنچی۔ تو نئی رانی نے راجہ سے جھنجلا کر کہا۔

جواب پھولندے کا

دوہا

"جلد" نکالو سوت کو "محلوں" سے بھرتار
بے جائے دو جے "محل" ذرا نہ کرے اَبار[۵۱]

چوبولہ

ذرا نہ کرے ابار، "قدم" "محلن" میں جبھی دھرونگی۔ ڈولی سے جبھی اتروں جو کہل کراسب لوں گی
دیکھ سوت کو جلے "بدن" کیسے "دل" "صبر" کرونگی۔ سدا کرے گی راڑ سوت میں کہاں تک نیچی دول گی

دوڑ

"گذر" نا ہوے میری۔ کروں "بختن"[۵۲] کی ڈھیری۔ سوت ہر "وقت" ستاوے
رہنا پاس سوت کے میری سمجھ نہ آوے

رنگا چار کہتا ہے۔ کہ اس پر راجہ نے اپنی بڑی رانی سے کہا، کہ جو کچھ تم نے کہا تھا وہی آگے آیا، دوسرا "محل" کھلوا کر جار ہو" دیر" مت کرو۔ اس نے جواب دیا اے پران ناتھ جو کچھ آپ "حکم" دیں گے وہی میں "منظور" کروں گی۔ میرا کیا "مقدور" کہ "محل" خالی نہ کروں۔ چنانچہ امباولوی نے فوراً وہ

---

۵۱ ادیر۔ تاخیر

۵۲ بخت۔ نصیب

محل خالی کر دیا۔ اور پھولندے رانی محل میں آباد ہوئی۔ پھولندے شباب سے مست ہو رہی تھی۔ راجہ صاحب کی "جوانی" ڈھل چکی تھی۔ راجہ صاحب امور سلطنت میں مصروف رہتے، اور جوبن میں چور رانی اپنے دل سے یہ باتیں کیا کرتی۔

پھولندے کا بچار کرنا

دوہا

موتن۔ جوبن، چور ہے پریتم کا یہ "حال" ۔ "طاقت" "بے باقی" ہوئی کوری ٹھنٹھن گوپال

ٹھمری

بھرتا بوڑھے جوبنا میں آئی "بہار" ۔ رات ٹھنٹھن، دن، موکو کرے کام "بیدار"
سیاں کو دیکھو، ورشا، تو ہلتی نار[۵۱] جی ۔ بھرتا بوڑھے جوبنا میں آئی بہار

"صرف" "ہنسی" "باقی" "بیٹھ گئے" "رخسار" ۔ "حسن گلستاں" ادھر پھول رہی پھلوار جی
بھرتا بوڑھے جوبنا میں آئی بہار
اس ڈگرا[۵۲] کے بھوگ مٹے نہ "دلی غبار" ۔ ملے "مہ جبیں" "ماہرو" "قطعدار" "دلدار" جی
بھرتا بوڑھے جوبنا میں آئی بہار
"رنج" جب ہی "غم" ہو ملے "ساز" "میں ساز" ۔ مروں کٹاری کھا کے "گل" ہے "زندگانی خوار" جی
بھرتا بوڑھے جوبنا میں آئی بہار

دوڑ

کروں کیسے کِت جاؤں، کون بدھ من سمجھاؤں، "تمنّا" ہوئی نہ "حاصل"
کنتھ ہمارے ڈھیلے ڈھالے لڈنے ہی کے "قابل"

---

۵۱ نار یا ناڑ۔ گردن ۵۲ ڈگر۔ راستہ

اب راوی ایک رات کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے

جواب رنگا چمار کا

دوہا

رانی کو "شش پنج"[۵] یہ بگڑے ہوئے "حضور" ۔ پھولندے ات ہو رہی مدن "جوش" میں چور

چوبولہ

مدن "جوش" میں چور "رانی" ہتی رہی نہ "قراری" ۔ ایک دن پھولندے تھاری اپنی چتر ساری
پورن مل کی جائے رہی "گلشن" کو "سواری" ۔ دیکھ ہوئی "مشتاق" "عشق" کی کھائی "جگر" کٹاری

کڑا

پیارے جی۔ جوبن جل کے مچھری بیکل بیدم ۔ جو رانی کی دشا ہوئی کہی نہ جاتی۔
نہ کہی جات جو ہوگیا "حال" پھولندے رانی کا ۔ "چھب" "دار" ، "حسن" "پر لاجواب" دیکھا نہیں اس کی "ثانی" کا

دوڑ

"نور" سانچے میں ڈھالا ، "عشق" کا کھایا بھالا ، "حسن" لاکھوں میں "اعلیٰ" ۔ "قد" رانی کا "بلند بالا"
"بدن" "کا ہوش" بھلایا ۔ دیکھ دشا پھولندے کی باندی نے ایسا بچن سنایا

جواب باندی کا پھولندے سے

"نظر" لڑا کر کدھر دیکھ رہیں "سرکار" ۔ کیوں دینا "تن بدن" کا "ہوش" "حواس" بسار

چوبولہ

"ہوش حواس" بسار "کیفیت" "دل" کی کہئے ساری ۔ کس "غم" میں "مبتلا" "جان" میں سہو "مصیبت" بھاری
گئی ٹکٹکی کھڑی "مثالِ بت" کس لو میں پیاری ۔ ہوتی ہو "مضطرب" ، "مہرباں" کیوں نا ہوئے "قراری"

دوڑ

"فکر" تم کو "کمال" ہے ، نا جانوں کیا "حال" ہے۔ سستی بتلانا چاہیئے
"خدمت گار" "خادمہ" سے تو نہیں چھپانا چاہیئے

---

۵ شش و پنج

ذرا اس سانگ کی زبان، طرز ادا، بندش، فارسی ترکیبیں ملاحظہ کیجئے یہ وہ زبان ہے جس کو برج اور دوسرے علاقوں میں بولا، لکھا اور سمجھا جاتا ہے، میں نے اقتباس بہت اختصار سے دیا ہے ورنہ سارا سانگ اس زبان میں لکھا گیا ہے۔

ایک اور شخص رام لال نے جو نواح دہلی کے دیہات کا آدمی ہے۔ پورن بھگت کا سانگ لکھا ہے۔ ذرا اس کا نمونہ بھی ملاحظہ کیجئے، مگر یہ خیال رہنا چاہئے، کہ یہ شاعر برج کا رہنے والا نہیں ہے۔ اور اس کی زبان پر حصار و رہتک کے زبان کا اثر ہے۔ قسم وار نمونے نقل کئے جاتے ہیں۔

(نمونہ) چھند

جنجال جی کا ہو" بلا شک" "دوستی" "نادان" کی ۔ "کم عقل" اوچھی "ہنس" میری بھی "عقل" "حیران" کی

"صحبت" "شریفوں" کی سی "دانشور" سا کچھ دکھلائیگا ۔ "دلیکن" "تخم تاثیر" اور "ذاتی" "اثر" کہاں جائیگا

بک بک نہ کر بس بیٹھ جا "چپ ٹھانی" "بحث" "ٹھالی" نہیں، جاؤنگا میں جانونگا میں جاؤں گا مانو نہیں

(نمونہ) بحر طویل

اری رانی یہ راجہ نے ادھرم کیا۔ چڑھایا جو سولی پہ اپنا "پسر"

لے نیوتی سے میں پھر سیوتی کروں، میں جلا دوں آنکھوں کے دکھ "فکر"

جا کے چہرے پہ کر کے نظر لاش کو ڈال جھکی بھبوتی گرو کو "سر"

کہیں، زندہ کنور کیا، زندہ لیلے گودی میں رانی ہوا یہ امر

(نمونہ) راگنی

میرا پورن کس نے مارا، ترا بھلا کرے بھگوان ۔ ہاتھ پیر کٹوا دئیے، وہ پڑا کوئیں میں آن

پتر بچھیویا "دغا" کری، کیا ئی "دلمیں" "ٹھان" ۔ میرے "دل" کو سوگ ہوا، میں نے آنند لینا جان

(نمونہ) دوہا و چنبولہ

دوشں ترا کچھ نا، کیا تو ہوئی مست ہیں

ست با دی پتر میرا، آتا نہیں "یقین"

آتا نہیں "یقین" تُو تو پاپن کہلاتی ۔ نہیں تجھ سی "بے حیا" میری تُو تو پھونکے چھاتی
جا ڈوب کیوں نا مری، کیوں مُنہ دکھلاتی ۔ میرے سے تے "دغا" کرے ہیں ٹُری "جلاتی"

دولا دھاڑی

ایک سانگ دولا ڈاکو کا دیہات وقصبات میں اکثر کیا جاتا ہے۔ مصنف اس کے گمنشام داس ہودلیو پرشاد ساکنی کے رہنے والے ہیں۔ جو علاقہ برج میں واقع ہے۔

قصّہ میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ دلیپ سنگھ نامی جس نے دولا نام اختیار کر لیا تھا شاہ نورنگ کا (جو غالباً شاہ جہانی عہد کا کوئی پنجابی صوبے دار قصے سے معلوم ہوتا ہے) اس لئے دشمن ہو گیا تھا کہ نورنگ نے اس کے باپ کو جو ڈاکو تھا قتل کرا دیا تھا۔ رنگا چار اس قصّے کو یوں بیان کرتا ہے:۔

جواب رنگا چار کا

دوہا

"کل" "ادنی" اور "اعلیٰ" سنو یہ مضمون "جناب" ۔ "دنیا" میں ہے "ظاہرہ" "ملک" اک پنجاب

چوبولہ

"ملک" ایک پنجاب کہوں وہاں کی ایک کہانی ۔ "پیدا" ہوا "زبیر" دلاور" بیر بھٹ مانی
انہی دنوں "شاہ" نورنگ کی تھی "سلطانی" ۔ اُسی "ملک" میں تھی گدھ صندل چھوٹی راجدھانی

قوالی

وہ دولا دھاڑوی وہاں پر بیر بانکا تھا ۔ "سپاہ" کچھ سنگ میں رہتی لڑکا وہ "ادا" کا تھا
اور وہاں نو گاؤں کی "باقی" نہ دیتا شاہ نورنگ کو ۔ سدا "بے خوف" تھا نہ "ڈر" شاہِ جہاں" کا تھا
"دغا" سے اسکے "والد" کو شاہ نے کر "فنا" دینا ۔ سنی جب سے ہوا "دل" پر "بہادر" کے سنا کا تھا
سونچتا تھا سدا کہ کب بدلہ لیلوں والد کا ۔ اسی "شش پنج" میں ہر "دم" "دست خنجر" "فنا" کا تھا

دوڑ

دلّی دل کا "خیال" تھا۔ بڑا بھاری "ملال" تھا۔ "شوق[1]" "والد" کا "جاری"
سنگھ دلیپ نے ماتا سے "عرج گجاری[2]"

جواب دھاڑی کا ماتا سے

دوہا

"عرج[3]" "برخوردار" کی سن میّا دھر دھیان ۔ "شہر" میں "دردر" جائے کر سنا ایک "بیان"

چوبولہ

سنا ایک "بیان" "جبھی سے" "جگر" جلاتا ہے ۔ ہر دم آوے "یاد" یہ "دل" "غم" "میں" "غوطہ" کھاتا ہے
اس "رنج" مجھے نہ کھانا پانی بھاتا ہے ۔ "والد" کے مرنا کا "خیال" جنّی مجھے آتا ہے

دوڑ

میرا "دل" بڑا کہا ہے۔ چڑھا "غم" کا "غبار" ہے۔ "حال" سب "معلوم" تجھکو
کا یدھ مارے گئے تبا۔ جنّی بتلاوے مجھکو

جواب ماتا کا دلیپ سنگھ سے

دوہا

بیٹا چھو ہونا لاڈلے متی بنے "نادان" ۔ بہکایا کس نے کنور میرے جیول پران

چوبولہ

میرے جیول پران تجھے کیا "خواب" "نظر" آیا ۔ یا کوئی "دشمن" نے بیٹا تجھکو بہکایا
ہوا کیوں "غمگیں" تیرے کیوں نین جل چھایا ۔ سوچ کر کیا نہیں "کام" وہی رچھیتایا

---

[1] شوق

[2] عرض گزاری

[3] عرض

دوہڑ

"خیال" جھوٹا یہ تیرا، مان ست کہنا میرا۔ امر جگ میں کوئی نا ہے۔
مرتے جیتے سدا سب ہی۔ ست سوچ تیرا برتھا ہے

لاونی بھی نمونہ دیکھنے کے قابل ہے

جواب رنگا چار

دوہا

لاش پاس وہیں سس بہو بتلائے - کچھ "خیال" کر پدم سنگھ لیا نول کو ساتھ

لاونی

لیا نول کو ساتھ چلا "عرصہ" نہیں ذرا لگایا ہے
پدم سنگھ نے "شاہ" کو جھک کر" آداب بجایا ہے"
کھڑا سامنے کیا نول کو پدم سنگھ بڑا "ہشیار"
شاہ نورنگ سے بیمر کرنے لگا" شیریں گفتار"
سمجھا بجھا" بادشاہ" کے" قدموں" پر دیا بھتیجا ڈال
یہ گت دیکھ "شاہ" نے لیا نول سنگھ کو پچکار
گودی بیٹھال" شاہ" نے اسے دھیرج بندھایا ہے
پدم سنگھ نے شاہ کو جھک کر" آداب بجایا" ہے
ہینچہ دھرا سیس پر چھاتی سے لگا کر" پیار" کیا
" شاہ" سب " رنج وغم" "دل" کے "بیشمار" کیا
کر "معاف" "قصور" اسے صندل گڑھ کا "سردار" کیا
دیئی" اجازت" لاش پھنکوا سب جھگڑا پار کیا

بھگت پہلاد

پہلاد بھگت کے قصے پر بھی بہت سے دیہاتی شاعروں نے سانگ لکھے ہیں - ان میں سب سے زیادہ مقبول عام نتھا کا بنایا ہوا سانگ ہے - جو ہاتھرس کے قریب کا رہنے والا ہے اس لئے اُسے " برج باشی" ہی کہنا چاہئے - اس سانگ کا خاص انداز یہ ہے کہ شاعر نے " رنگا چار" (راوی) کا کام خود اپنے ذمّے لے لیا ہے - جسے وہ " جواب کب کا " لکھتا ہے. "کب" "کوئی" یا "کویت" اور "کبیت" کا اختصار سمجھنا چاہئے - چنانچہ پرمیشور کی حمد و ثنا کے بعد قصہ اس طرح شروع کرتا ہے :-

جواب کب کا

دوہا

بسے "ملک" پنجاب میں "شہر" ایک ملتان - یہیں ہرن کشیب نرپت ہوا بڑا ملوان

پھر آگے کہتا ہے. کہ اس کا ایک بہت "ظالم" بھائی تھا - جس کو انسانی روپ اختیار کر کے رام نے مار ڈالا - جس کا اس کو بڑا صدمہ ہوا - مگر اس نے بہت ریاضت کی - جس پر خوش ہو کر شنکر جی آئے - اور کہا کہ مانگ کیا مانگتا ہے ؟ اس پر اس نے کہا کہ مجھے وہ قوت عطا ہو - کہ نہ کوئی "انسان" مجھے مار سکے، اور نہ کوئی "جانور" - اور نہ میں رات میں مروں اور نہ دن میں نہ زمین میں نہ "آسمان" میں - اور نہ کوئی ہتھیار مجھ پر اثر کر سکے - آپ اپنا وعدہ "دل شاد" ہو کر پورا کیجئے اس کی مراد پوری ہو گئی - اور جو مانگا وہ اُسے دیا گیا - اس پر بہت "خوش" ہو کر اس نے "حکم" جاری کر دیا کہ کوئی رام کا نام نہ لینے پائے - جس سے سب کو "خوف" پیدا ہو گیا - چنانچہ لوگوں نے "بالکل" رام کا نام لینا چھوڑ دیا - اور جس نے حکم کی خلاف ورزی کی "فوراً" سولی پر چڑھا یا گیا - ایسی "سزا" سے سب پر "دہشت" چھا گئی۔

ہر فرعونے را موسیٰ کے مصداق، اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام پہلاد تھا۔

ایک دن وہ لڑکا "شہر" میں گھومتا گھامتا ایک کمہاری کے آوے کے پاس جانکلا، جو رام کا نام بھج رہی تھی۔ جس پر پہلاد کو "غصہ" آیا۔ تو اس نے کہا:-

جواب پہلاد کا

دوہا

کیوں ری پاگل کمہاری لے تو کس کا "نام"
"خبر" پتا کو کریں ہو تیرا "کام تمام"

قوالی

"بے خوف" ہو کے من میں کس کو منا رہی ہے ۔ لے جان تیرے "سر پر اب "موت" چھا رہی ہے
"خاموش" "جلد" ہو جا ہے جو "زندگانی" ۔ "والد" نے جا کہوں گا رس مجھکو آ رہی ہے

ایک غزل بھی لکھی ہے۔ جس کے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

"تا بہ حشر" بھولوں نہیں ماتا ترے "احسان" کو
"دانا" بنا دیا تونے بچپن میں مجھ نادان کو
"بے خوف" رہ، ہر "طور" سے مت کرے کچھ بھی "فکر"
"طاقت" ہے یہ اب کون کی، جو لیلے تیری "جان" کو
اب رام پر" دل" "جان" سے" قربان" ماتا میں ہوا
دیدوں گا اپنی "جان" تک، چھوڑونگا نہیں اس ٹھان کو

اس شاعر نے مقفےٰ عبارت بھی لکھی ہے۔ جو "وارتا" کہلاتی ہے جس کو مثالاً درج کیا جاتا ہے:-

جواب ہرن کشیب کا

وارتا

گروجی کنور پہلاد کو کسی نے ایسا بہکایا ہے۔ کہ کچھ "ٹھکانا نہیں" "بالکل" باولہ بنایا ہے۔ "دشمن" "کا" "نام" "لیتا ہے۔ سمجھانے پر ذرا دھیان نہیں دیتا ہے۔

جواب گرو کا

وارتا

اچھا راجن ابھی کنور کو لئے جاتا ہوں۔ آپ نہ گھبرائیے، "تسلّی" لائیے بہت اچھی "طرح" سمجھائے اُسے سیدھے راستے پر لاتا ہوں۔

اس شاعر نے تھیٹر کی وضع کی بھی اپنے سانگ میں نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے زمانے میں تھیٹروں کی مقبولیت نے اسے یہ رنگ اختیار کرنے کے لئے غالباً آمادہ کیا ہے۔

جواب گرو کا

تھیٹر ----- (یعنی بطرز تھیٹر)

پاجی "بے ایمان" "بدکار"، دونگا ابھی بہت میں مار، مجھکو مت کرے "بے زار" مان مان مان

جواب پہلاد کا

مجھکو "خوف" "نہیں" "زنہار"، دیکھو "خوب" "سنبھل کر مار" رام کے اوپر میں بلہار ہیں یہ پران پران پران

جواب گرو کا

تیری سُن سُن کے "گفتار"، رس آتی ہے "بیشمار" ٹھانے مت "نادان" "گنوار" ایسی ٹھان ٹھان ٹھان

جواب پہلاد کا

میرے، تن کے ٹکڑے چار، ہوں پر رام نام پہ پیار، کرونگا "صحیح" "مری" "گفتار" لیجئے جان جان جان

اس سانگ کا ایک دوہا اور نقل کرنے کو دل چاہتا ہے۔ جسے پڑھ کر شاید ناظرین حیران ہو جائیں گے۔

کہ دیہاتی اپنی بولی میں "نطفۂ حرام" بھی بولتے ہیں۔

دوہا

"پیدا" ہوا کپوت، یہ پاجی "نطفِ حرام" سمجھا یا مانے نہیں لے "دشمن" کا "نام"

قصۂ نل ودمن

اس قصے کو علی بخش نامی نے جو ریاست الور کا رہنے والا معلوم ہوتا ہے۔ سانگ کی شکل میں منتقل کیا ہے۔ نل ودمن کا قصہ بیان کرنا چونکہ نفس مضمون سے بالکل تعلق نہیں رکھتا۔ اس لئے تھوڑا سا کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ جو درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

جواب رانی کا

دوہا

کنتھ، کٹھن بارہ برس، اور برکھا کے "دور"، - سجن جھڑی بارہ گھڑی، تم کر لو "منظور"

چوبولہ

سجن جھڑی بارہ گھڑی تم کر لو "منظور" - کہیں برسے کہیں اوگھڑے، یہ برسا کا "معمول"
مری اٹاری "چوکھنٹی"[1] پانی جھڑنا بھول - برس برس بیری بادرا، تو "بیشک" ہیمتی بھول
سکھی ساون آئے پھر "محل" میں "ریشم" ڈوری گیر

جواب رنگا چمار

دوہا

امڑ، گھمڑ کے جھڑے، نہیں نردر گڑھ کی "خیر" - پر لو میں مل جائیگا جو برسے ڈیڑھ "پہر"

چوبولہ

ہو گیا اور سے اور، نظر پھر دیکھ پیو کی پیاری - نیچے سے پانی چڑھا "محل" کی ڈوبن لگی اٹاری

---

[1] مرکب فارسی لفظ چہار و ہندی لفظ کھنٹ ہے

رانی یہ پراشوت کے لگے میری "خلق" ڈوب جا ساری ۔ کر رکھا کو بند، میں نے آندر پت لوٹ لئی ساری

میئر

رانی سن میری "اراوش"[۱] راجہ ٹل ہے "نوکر" "خاص"

دوہا

بکھاشیش پہلے لیا، سمے بدل گئی اور ۔ نیر سمایا دھرتی میں ہوا "طور بے طور"

چوبولہ

ہوا "طور بے طور" رانی کی "فوج" "بگڑ" گئی ساری ۔ مچی "ملک" میں لوٹ "خلق" سب ڈوبے ماری ماری

کھول "خزانہ" دیکھتے جی راجہ کا بھنڈار ۔ کنچن ہو گئے کوئلہ تو تیری "قدرت" پہ بلہاری

میئر

کرتا "قلم" گہی "بے طور" جگت میں کوئی نہ تسا اور

جواب راجہ کا

دوہا

کنچن ہو گئے کوئلہ، بیری ہو گیا "جہاں" ۔ وہی لوٹ کر لے گیا جس کا گھمنڈ "گمان"

چوبولہ

تھا جس کا گھمنڈ "گمان" انھوں نے ایسی دھوم مچائی ۔ ننگی کر کے رانی وٹی "بیک" دیا نہیں آئی

"دو"[۲] سے رانی چھوٹی میری آج تک نا پائی ۔ ایک رانی دمودنی میں نے "شکل" سے دیکھائی

میئر

"جان" "قربان" کر دنگا، نہیں میں تجھے تجونگا ۔ شیش پہ بپتا سہونگا

---

۱ عرضداشت

چوبولہ

برکھا شیش پہ لے لئی میرے چھٹ گئے "عیش آرام" ۔ ایسی لوٹ مچی "محلن" میں ہوئی "فجر" سے "شام"
سب نوکر "دشمن" ہو گئے "نمک حرام" ۔ یہ "چار جامہ" بچا تو بن گھوڑے کس "کام"

میئر

کرتا "قلم" کبھی "بے طور" جگت میں کوئی نہ تھا ہو

لاونی کا نمونہ یہ ہے ۔

لاونی

جواب رانی کا

سن سن ری گجری بہنا ، ہم تو دو بہو کے "مہمان" چھاچھ تھوڑی سی دینا

گجری کا جواب

چل چل ری ہٹ تو کون کدھر سے آئی ۔ مرے بچھڑے بدکے جائیں پرے ہٹ جائی

جواب رانی کا

ترے بچھڑے، بچھیا بھی "سلامت" سائیں ۔ ہم ترے دوار پہ چھاچھ مانگنے آئیں

جواب گجری کا

نہ ملے "مفت" میں چھاچھ اری تجھکو ۔ میں نے "مطلب" کی بات کہی تجھکو

جواب رانی کا

تو کیا "مطلب" لالچ کی ماری بولی ۔ میں نے اپنا دربہ لٹا دیا بھر بھر جھولی

جواب گجری کا

تو بڑی درب کی دھائی کہاں سے آئی ۔ تجھے چھاچھ مانگتے ذرا "شرم" نہ آئی

جواب رانی کا

کہاں رہے "شرم" جب پاپی پیٹ پکارے ۔ ہو گئے دن سات ہمکو بھوک کے مارے

جواب گجری کا

کیوں بھولی مرے ساتھ "مرد" ہے تیرے ۔ رت آئی دیوؤں گی ٹوکر رکھدے میرے
تو چیری چنچل نار، جیبھ کی کھوٹی ۔ تو "کسب" کما کر کھلا "خصم" کو روٹی

اس کتاب نل دمنتی کے سانگ کے ختم ہونے کے بعد دو ہولیاں مہاراجہ جے سنگھ والئے آلور کی شان میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ جن میں سے ایک رامچند نے لکھی ہے اور دوسری رامچند اور رنجیت دو شاعروں کی کہی ہوئی ہے۔ جن کے اقتباس درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

پہلی ہولی کا نمونہ

ٹیپ:- مہاراجہ جے سنگھ، آئی ہولی کی اُمنگ

---

(۱) سب رے "تیار" کرائے، رنگ بھر بھر ہوری
سمت اینس سے چوّن، بھیجے گاؤں گاؤں میں سمّن، کھیلیں چھتری، بنیے، بمّن، مل مل ہولی

کرشن چیت شنیچر باجیں، گھر گھر بھاگ مہاتم باجیں۔ سرے گلی گلی میں ناچیں سارے نرناری

پرتھم محلوں آنند بھاگ، گیانی گاویں گندر یہ راگ، ہولی کھیلن سُوتے بھاگ، ساری "سرواری"

رنگ کی "مشکیں" بھریں پکھال، "چلتے" تم تمے "فی الحال" ماریں ڈھولچی تک تک کال، اور پچکاری

پی پی امل بھنگ اور دارو، رسیے راگ گاویں مارو، ہولی کھیلت چیت چارو، "کھلی" "گل" کیاری

"عام خاص" ہورہا "آباد"، "خواص" کھیلے "خانہ زاد" کبیر کند کسوم گاد تا آباد" اڑتے لمے پر داد

ہولی کھیلیں آپ "حضور"، "بجتے" تاشے"، "ترئی"، "تنبور" ٹھاریں توپیں اور "جنبور"[۵۱] "دیکھیں گوری

سمت انیس سے چمّن، بھیجے گاؤں گاؤں میں سمّن کھیلیں جھتری، بنئے، بمّن، ہل مل ہوری

دوسری ہولی کا نمونہ

سری بجے سنگھ جی مہاراج، ہونگے بادن گڈھ "سرتاج"، ساجے سب ہولی کے "ساج"[۵۲]
"مشلیں"[۵۳] ری ری
ہاتھی گھوڑے سب "پچرنگ"[۵۴] ہورہا "شہر" میں ناچ اور رنگ، ہولی کھیلن سب کے سنگ
—— کیسر گھولی۔
جو تھے "دور" یا تھے نیڑے جنہیں" جوان" بانکے ڈٹے، "حکم" بھیج بلوائے بیلے،
آئے جھٹ، پٹ ——
سکینڈ[۵۵] نائن اور پلٹن، آئی "محل" چوک میں بن ٹھن، جنہیں "جوان" سارے ایک من،
ٹھاکر، بامن، گوجر، جٹ،

---

۵۱ زنبور، چھوٹی قسم کی قدیم توپ،
۵۲ ساز
۵۳ جمع مشعل کی
۵۴ پنج رنگ
۵۵ سیکنڈ نائن ۹/۲ فوج کا نمبر ہے۔

باجے بجے "بے شمارے" بین بانسری "ستارے" زرب کی پوری
آگے آگے کپتان کرنل، "افسر کھڑے" بہل دربہل "پہلے کینی" "شلا[۱]" جرنل
سب سے کینی ہے "سلام"۔

عشق مجنوں

مذکورہ بالا سانگ نل دمنتی کا اقتباس، راجپوتانے کے مسلمان کا ابھی آپ نے ملاحظہ کیا تھا، لیکن اب ذرا نتھارام ہاتھرس نواسی، برج کے ایک ہندو شاعر کا بنایا ہوا سانگ بھی ملاحظہ فرمائیے، جو اس نے ایک خالص عربی قصے کو سن کر لکھا ہے، ابتدا اس طرح کی گئی ہے :-

دوہا

"قلم" نہ "ہرگز" لکھ سکے، "صفت" "عالم الغیب"
لے "قادر" اے "کبریا" "ذات" تری "بے عیب"

چوبولہ

"بے شمار" "اسرار" "لیل ونہار" رہتا ہے ۔ "گنہگار" "بندوں" کا "ہردم" "مددگار" رہتا ہے
رہے نہیں "بے خبر" بہت کچھ "خبردار" رہتا ہے ۔ "حال" "نہاں" "بشر" کا تجھے "آشکار" رہتا ہے

بحر طویل

"رب المالک" ہے "عزت" "دو عالم" کا تو "آسماں" ہے ترا اور "زمیں" ہے تیری
کوئی آتی نہ دہ ہے "نظر" کے تلے، "نہاں جس" "شے" "میں" "قدرت" "نہیں" ہے تیری
دی دکھائی نہ "لیکن" "تعجب" ہے یہ "حسن" کی "روشنی" "چارسو" ہے تیری
"جا بجا" تو ہی تو ہے "جلوہ نما"، چھوہ نما، چھوہ نرائی ملے "پردہ نشیں" ہی تیری

---

[۱] صلاح

دوڑ

میں ہوں "بندہ" "نادان" "خدا" ہو مجھ پر "شاداں" "عقل" دے، سناتا ہوں
"داستاں" "دلچسپ" بناتا ہوں لیلیٰ مجنوں کی۔

لیلیٰ مجنوں کا سارا قصہ جو ۴۰ صفحوں پر سانگ کی صورت میں ہے تمام تر اسی زبان میں لکھا گیا ہے جو منقولہ دوہے اور جو بولے میں اختیار کی گئی ہے، اس لئے صرف شاعر کے آخری اشعار جو اس نے بطور راگنی اختتام قصہ کرتے ہوئے لکھے ہیں اور درج کئے جاتے ہیں:-

جواب کب[1] کا

ایسے کہہ، سانس بھری تیں نے، کر کے لیلیٰ ہی لیلیٰ گیا ہے وہ مر
دونوں بیٹھے ہیں جا کر کے "ملک عدم" "عشق بازی" کا کر کے دکھایا "حشر"
"واہ واہ" "انسان" ہر ایک کرنے لگا، ہوا "تعریف" "کا" "زبان" "پہ" "ذکر"
"واسطے" "لیلیٰ مجنوں کے کھدوائی ہے" "مشورہ" کر کے لوگوں نے جھٹ اک "قبر"
پاس ہی پاس دونوں کو "دفنا دیا" آ گئے لوگ سب لوٹ کر اپنے گھر
واہ واہ واہ واہ کر گئے "نام" "دنیا" میں دونوں امر۔
کیا "قصہ" "ختم" "وج نتھا رام" "معاف" "کرنا پڑے گر جو "غلطی" "نظر"
بس یہیں پر "قلم" روپ کر رک گئی۔ جے اٹل چھتر کی بولئے "کل" "بشر"

ڈونگی

ڈونگی کے قصے کے سانگ دوہریانے (اضلاع رہتک، حصار، کرنال وغیرہ) کے شاعروں

---

[1] کوئی، اجنبی شاعر

لکھمی چند اور ٹیک چند نے علیحدہ علیحدہ لکھے ہیں۔ پہلے لکھمی چند کے بنائے ہوئے سانگ کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

نوٹنگی لکھمی چند

دوہا

اے ایشور سب کے دھنی، جگت رچاون ہار
مجھ مورکھ "ناچیز" کو دیئیے پار اُتار

اپدیش

ٹیک:۔ بھارت کو کھو دیا "غرق" ناس میں کوئی کوئی "نس" "باقی" سے

(۱) پیار تے "دغا" کمالے، سر پے باپ کا بھار اٹھالے، بیٹی کے روپیہ کھالے،
ناریت برتی نیلے سے، بھارت کھو دیا ... الخ

(۲) اُوں نے بنا پھرے "عقلمند" چاتر، ارے جس گھر کو سندر پاتر،
پھر یاری کرن کی "خاطر" کرے "طراں طراں"[۱] کی چلائی سے۔ بھارت کھو دیا ... الخ

(۳) ناپاپ کرن تے ڈرتے، "جگہ جگہ" گکرم کرتے پھرتے، "شرم" نا ہین کی کرتے،
چاہے کوئی دادی، تائی، کاکی، سے۔ بھارت کھو دیا... الخ

قصہ کا آغاز اس طرح کرتا ہے:۔

دوہا

سیالکوٹ کے بیچ میں ہوئے گجے سنگھ سردار
دو پتر جن کے لاڈلے، چندرماں کے اونہار

چوبولہ

چندرماں کے اونہار کرے تھے "خوب" کمائی ۔ بڑے بھائی بھوپ کی تھی "حورم" لگائی

---

[۱] طرح طرح

پھول سنگھ چھوٹے کے نا بیاہ سگائی ۔ بھاوج کے کہنے سے جا نوٹنگی بیاہی

کمتال

" حال " میں سبھی سناؤں جی ۔ نار نوٹنگی بیاہوں جی

دیا بھاوج نے " طعنہ " مار ۔ " شہر " ملتان کو جاوں جی

بارتہہ[۱]

" سردار " کسی " وقت " کا " داستان " ہے ، کہ بھوپ سنگھ کا چھوٹا بھائی پھول سنگھ اپنے ' یار ' کندن سیٹھ کے ساتھ بن سے " شکار " کھیل کر " واپس " آتا ہے ، اور اپنی بھاوج سے آکر کیا کہتا ہے ۔

اس سانگ نے حسن اتفاق سے ہریانے کی زبان کی بالکل صاف تصویر کھینچ دی ہے کہ " بارتھ " کے بہانے سے نظم کے علاوہ نثر بھی آگئی ہے ۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کیا زبان بولی جاتی ہے ۔

نوٹنگی مصنفہ ٹیک چند

پر آتھنا (دعا) کے بعد اس طرح شروع کرتا ہے ،

دوہا

جو " وعدہ " تینے کیا ، مت ناکرے " خلاف " ۔ بہو بنا کے اپنے لال کی مُنّے لے چلئے آپ

کافیہ[۲]

چولی " زیور " جلدی لیا رے ، اتنے " عطر " پھلیل ملوں میں

---

[۱] ارتھاؤ ' یعنی وضاحت

[۲] مراد قافیے سے معلوم ہوتی ہے کہ اس طرز نظم میں قافیے کا التزام نظر آتا ہے ۔

ایک چمکدار ساڑی لیا دے ، باندھ کے تیرے ساتھ چلوں میں
بے دھڑکے چلوں "محلن" میں مالن " ہرگز " نہیں ٹلوں میں

جواب کوئی کا

پھول سنگھ کے سن بچن مالن " خوش " ہو جائے
چولی " زیور " تم سب دی مالن نے لیائے

جواب پھول سنگھ کا

دوہا

دیس ، نگر ، گھر ، چھوٹ گیا ، لگے جس کے " عشق " " تیر "
ننگی کے کارن ہنوں ایب[1] مر وتے بیر

ٹیک :- یہ " مردانہ " باند تار[2] دھار لیا روپ لگائی کا ،
" زیور " لیا پھر بہتیرا ، کچھ بندی نے ، سج گیا ، چہرہ ، گل میں گیر لیا چندن ہار
نین میں ڈورا " سیاہی " کا

(۲) بنی مالن درشن کی لاہڑی ، پھول سنگھ کے کھڑی اگاڑی ، باندھ لی ساڑی " بوٹے دار "
کرے تھا " کام " " صفائی " کا .

(۳) ساڑی بنی " ریشمی " ہری ، " سرمائے[3] " جائے[4] دیکھ " پری " ، " قدم " دھری آگے " دو چار "
کھڑ کا جول " جہاز ہوائی " کا

---

[1] اب
[2] اُتار
[3] شرمائے
[4] جسے

اس سانگ میں بھی صدہا الفاظ فارسی کے نظر آتے ہیں جس کا اندازہ اس نمونے سے ہی ہو جائے گا۔

اس مضمون کے ناظرین کو یہ اندازہ تو ہو گیا ہوگا۔ کہ ہمارے " ہندوستانی " دیہات میں کیسی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن آیندہ اشاعت میں ہم یہ بتائیں گے کہ وہ کون سی زبان ہے۔ جو ہندی پرست اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں، اور پھر یہ موازنہ بھی کریں گے، کہ دیہات کی روزمرہ نام نہاد ہندی ادیبوں کی زبان سے قریب ہے یا اُردو ادیبوں کی زبان سے علاوہ ازیں اگر فرصت ملی، تو ایک فہرست اُن فارسی و عربی الفاظ، استعارات، محاوروں اور ضرب الامثال کی پیش کریں گے۔ جو دیہاتی زبان میں مدت سے رائج ہو کر جزو زبان بن چکے ہیں۔



قدیم ترین تراجم

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب کہ مختلف مغربی اقوام نے ہندوستان میں تھوڑی بہت قوت حاصل کر لی۔ اس سلسلہ میں اولین قابل ذکر کوششیں عیسائی پادریوں کی ہیں جنھوں نے وقتاً فوقتاً انجیل کے مختلف حصوں کے ترجمے کرائے۔ اب تک جو کچھ مواد دستیاب ہو سکا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انجیل کا ترجمہ پہلی دفعہ ہندوستانی زبان میں بنجامن شلٹزہ نے ۱۷۴۸ء میں کیا۔

فورٹ ولیم کالج | مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے ساتھ حکومت بھی شروع کر دی۔ اور اس کی قوت روز بروز زیادہ مستحکم ہوتی گئی۔ تجارتی اور حکومتی اغراض کے تحت کمپنی نے ابتدا ہی سے محسوس کر لیا کہ انگریزی ملازمین کو ہندوستان کے رسم و رواج اور معاشرت و زبان سے واقف کرانا ضروری ہے۔ چنانچہ اس بناء پر انگریزوں کے لئے دیسی تعلیم کا انتظام وقتاً فوقتاً کیا گیا۔ وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ کے انگریزی حدود میں ایک مشرقی مدرسہ قایم کیا تھا جہاں انگریزوں کے ساتھ ہندوستانی طلبہ کے لئے بھی لکھنے پڑھنے کا انتظام تھا۔

چونکہ کمپنی کے ملازم عام طور پر نوعمر انگریز ہوتے تھے اور انگلستان میں بھی ان کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر نہ ہوتی تھی اس لئے لارڈ ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کی جو تجویز پیش کی تھی اس میں ایشیائی زبانوں مثلاً عربی فارسی سنسکرت اُردو بنگالی تلنگی مرہٹی اور کنڑی کے علاوہ یورپین زبانوں میں لاطینی یونانی اور انگریزی اور علوم و فنون میں عام تاریخ شمالی ہندوستان اور دکن کا جغرافیہ دکن کی تاریخ اصول قانون اور تاریخ ہند (قدیم و جدید) کی تعلیم کا انتظام کرانا چاہا تھا۔ لیکن کمپنی نے اخراجات کے ڈر سے اس درسگاہ کو صرف مشرقی زبانوں کی تعلیم تک محدود کر دیا۔

اس زمانہ میں اردو یا ہندوستانی کو عام زبان کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی نصابی ضرورتوں کے

تحت اُردو ادبیات کی تلاش ہوئی ۔ اس کا سارا ذخیرہ شعر و شاعری پر مشتمل تھا ۔ اس لئے ادبی کتابوں کی تالیف و ترجمہ کے لئے ایک محکمہ قائم کیا گیا ۔ اس سر رشتہ میں اخلاقی قصص اور بعض تاریخی کتابوں کے ترجمے قدیم مشرقی زبانوں یعنی عربی اور سنسکرت سے کئے گئے ۔ دوسرے علوم یا سائنس پر کوئی کتاب اس عہد میں تیار نہیں ہوئی ۔

شمالی ہند میں اُردو نثر کی باضابطہ ابتدا انگریزی اثر کی بنا پر ہوئی لیکن اول اول اس پر انگریزی یا مغربی اثر بہت کم پڑا اور جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے فورٹ ولیم میں کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہندوستانی میں نہیں ہوا وجہ یہ تھی کہ دیسی اہل قلم انگریزی سے ناواقف تھے ۔ فورٹ ولیم کالج کے کسی اہم کام کا ذکر مغربی زبانوں سے ترجموں کے سلسلہ میں کیا جا سکتا ہے تو صرف اس اُردو انگریزی لغت کا جس کا ایک حصہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ۱۷۹۶ء میں چھپوایا ۔ فورٹ ولیم کالج اس لغت کی طباعت کے دو سال بعد ۱۸۰۰ء میں قایم ہوا لیکن چونکہ گلکرسٹ اس کالج کے روح رواں تھے اس لئے ہم نے ان کے کام کا ذکر اس کے سلسلہ میں کر دیا ۔

مرزا فطرت نے ول ہنٹر کی مدد سے ۱۸۰۵ء میں انجیل کے عہد جدید کا ترجمہ مرتب کر کے چھپوایا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ یونانی زبان سے کیا گیا ۔ ۱۸۰۸ء میں کپتان ٹیلر نے اپنی لغت شائع کی ۔ اس کے بعد ۱۸۱۱ء میں کپتان ٹامس روبک نے لغت جہاز رانی طبع کرائی جس میں جہاز رانی کی اصطلاحوں کے علاوہ ایسے الفاظ کا اردو ترجمہ بھی درج ہے جو کمانداروں کو میدان جنگ اور بارکس میں کار آمد ہو سکتے ہیں ۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ایک عرصہ بعد یعنی ۱۸۲۵ء کی لکھی ہوئی ایک کتاب دستیاب ہوئی ہے جس کا نام مجموعۂ گنج ہے اور جو کلکتہ اسکول بک سوسائٹی پریس میں چھپی ہے یہ کتاب چونکہ اولین تراجم میں سے ہے اور کامیاب ہے اس لئے اس کے کچھ اقتباسات درج کر کے زبان اور طرز بیان کی خصوصیات پر ذیل میں روشنی ڈالی جاتی ہے ۔

کتاب کے نام یعنی "مجمع گنج" کے نیچے حسب ذیل عبارت لکھی ہے ۔

"عقل روشن کرنے والی تعلیموں کا

اور

" . . . . والی تبلیغوں کا

اس میں

اکثر ملکوں کی بستی اور شہر اور آدمیوں کے احوال کا بیان ہے ۔

ہندوستانی لڑکوں کے لئے

انگریزی زبان سے زبان اُردو میں ترجمہ کیا گیا"

یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۱۷ صفحوں پر مشتمل ہے اور اس میں ۴۸ مضامین اور عنوانات ہیں جن کے تحت "تاریخ اور جغرافیہ کے ابتدائی مسائل بیان کئے گئے ہیں ۔

کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں اس وقت کے ہندوستان کی کیفیت لکھی ہے ۔

اس رسالہ کی عبارت میں قدامت پائی جاتی ہے ۔ جملوں کی ترکیب پر انگریزی تراکیب کا اثر نمایاں ہے بعض ایسے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں جو عرصہ ہوا متروک ہو چکے ہیں ۔ تجارت کی جگہ "سوداگری" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مثلاً " انگریزوں کے وقت میں ہندوستان کی سوداگری خوب چمک گئی" ۔ نے کے غلط استعمال اور جملہ کی ترکیب کی اجنبیت ملاحظہ ہو: "کمپنی کے سوا کوئی آدمی پوست کا کھیت کرنے اور افیون مول لینے نہیں سکتا ہے مگر کمپنی کے حکم سے" ۔ امریکہ ملک "برٹین کی ولایت" اور انگریز کا ملک" جیسی ترکیبیں جا بجا نظر آتی ہیں ۔ جملوں کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی انگریز کا ترجمہ ہے ۔

"ہند کی سوداگری کے بیان میں"

" ہند میں جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں دوسرے ملک میں لیجا کے بیچنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے اور ہند میں دولت مند ہونے کا بڑا وسیلہ سوداگری ہے ۔ جو چیزیں آدمی کے لئے ضروری ہیں ان کے بہتات سے پیدا

ہونے کے سبب ہند کے رہنے والوں کو غیر ممالک سے کوئی چیز لانے کی احتیاج کم ہوتی ہے بلکہ ملک سے بہت چیزیں جو اور ملکوں کے رہنے والوں کے لئے ضروری ہوتی ہیں خواہ کھانے کی چیز جیسا کہ دھان چاول گیہوں خواہ کسی صنعت کے لئے ہو جیسا ریشم روئی دوسرے ملک میں لے جاتے ہیں اور اسی سوداگری کے وسیلہ سے بہت دولت دوسرے ملکوں سے اس ملک میں آتی ہے۔"

انگریزوں کی عدل گستری اور گذشتہ بادشاہوں کے مظالم کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"اگلے بادشاہوں کے وقت میں ان کے ظلم سے لوگوں کے مال اور ملک میں امن چین نہ تھا اور جس ملک میں امن چین نہو اور معاملہ مقدمہ میں حق انصاف نہو بلکہ اسامی فریادی میں سے ایک کی طرفداری ہو تو کون آدمی اپنا روپیہ اور اسباب لے کے اس ملک میں جائے گا۔ اس سبب سے اور ملک کے سوداگر اس ملک میں کمتر آتے تھے اور یہاں کے رہنے والے یورپ کی اچھی اچھی حکمت اور کاریگری سے بے نصیب تھے۔

انگریزوں کے وقت میں ہندوستان کی سوداگری خوب چمک گئی اور بہت فائدہ مند ہوئی اور اس سوداگری سے بہتیرے غریب دولت مند ہوئے اور اکثر دولت مند بہت روپئے والے ہوئے۔ سچ ہے انصاف کے درخت میں ہی پھل ہوتا ہے اور امن و امان عدل سے ہوتا ہے اور خلائق اور رعیت خواہ نزدیک کے ہوں خواہ دور کے سب خوشی سے گزران کرتے ہیں۔"

شمس الامرا

اس زمانہ میں اردو ترجموں کا دوسرا اہم مرکز حیدر آباد تھا۔ حیدر آباد کے امیر کبیر نواب فخر الدین خاں شمس الامرائے ثانی بڑے علم دوست آدمی تھے۔ نواب موصوف نے اپنے اطراف کے علما کا ایک گروہ جمع کر لیا تھا جن میں سے بعض درس و تدریس میں اور اکثر تصنیف و تالیف میں مصروف تھے۔ گلزار آصفیہ کے موئف نے نواب کے علم و فضل اور علمی دلچسپیوں کے متعلق لکھا ہے۔

"آں سرخیل امرائے نامدار امیر ست صاحب شان و شوکت و شکوہ۔

.... صاحب تصانیف علوم حکمت علی الخصوص درعلوم ریاضی

کہ عبارت از ہندسہ وہیئت باشد ونیز درعلم جرثقیل رسالہ ہائے عمدہ تصنیف فرمودہ۔ ستۂ شمسیہ کہ مشہور آفاق اند۔ درنفس الامر علوم ریاضی راآں قدر سہل وآسان تر نمود کہ خلقے دراندک توجہ وشوق بحصول مقاصد ومطالب بلند وتاب دل پسند ارجمندی رسد اگر بوعلی سینا زندہ می بود داد ایں تحریر دل فزای می داد ....

" معہذا مدرسہ ہائے متعدد دربلدہ حیدرآباد باستادان کامل علوم مقرر فرمودہ کہ طفلاں غربائے بیشمار شبانہ روز بہ تحصیل علوم نقلی وعقلی مشغول ومصروف اند ....

نواب فخرالدین خاں کو ریاضیات اور علم ہیئت سے خاص شغف تھا اپنی علم دوستی اور علمی دلچسپی کی بنا پر انھوں نے اپنے زمانہ میں جو تراجم خاص اہتمام کے ساتھ اپنے سنگی چھاپہ خانہ میں چھپوائے وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ترجمے مستند اور اعلی پایہ ہونے کے باوجود ان کی شہرت حیدرآباد سے باہر بہت کم ہوئی۔ اور خود حیدرآباد میں موجودہ زمانہ کے علما میں بہت کم ایسے ہوں گے جو نواب موصوف کی تمام علمی تحریروں اور تصانیف سے کماحقہ آگاہی رکھتے ہوں ۔ جدید علوم سے نواب کی دلچسپی نے انھیں نہ صرف بعض مستند انگریزی کتابوں کے ترجمے اُردو زبان میں کرنے پر مجبور کیا بلکہ کئی رسالے طبعزاد بھی لکھے۔ اس کام کے سرانجام کے لئے کئی علما نواب نے ملازم رکھے تھے۔ ایک رصدگاہ "جہاں نما" تعمیر کرائی۔ تعلیم کے لئے مدارس قائم کئے اور کتابیں چھاپنے کے لئے سنگی مطبعے خانگی طور پر جاری کئے۔ اُردو میں علمی کتابوں کے تراجم کی ایسی منظم انفرادی کوشش نواب فخرالدین خاں کے سوا شاید ہی کسی نے کی ہو۔

ممکنہ تلاش اور جستجو کے بعد ہمیں نواب فخرالدین خاں کی حسب ذیل کتابوں کا حال معلوم ہوا ہے۔

"رسالہ مختصر جرثقیل" اور "رسالہ اصول حساب ۱۲۵۲ھ"

"رسالہ کسورات اعشاریہ" ۱۲۵۳ھ

رسالہ اصطرلاب کرُدی " ۱۲۵۵ھ

" ستہ شمسیہ " ۱۲۵۵ھ ۔ یہ سلسلہ حسب ذیل چھ رسائل پر مشتمل ہے ۔

" رسالہ علم جرثقیل " " رسالہ علم ہیئت " " رسالہ علم آب "

" رسالہ علم ہوا " " رسالہ علم انظار " (اس کے آخر میں علم مقناطیس بھی شامل ہے)

" رسالہ علم برتک "

" کیمسٹری کا مختصر رسالہ " ۱۲۵۹ھ

" رسالہ مفتاح الافلاک ۱۲۷۰ھ

" رسالہ کیمسٹری " ۱۲۷۱ھ

" رسالہ مختصر حیوانات مطلق ۱۲۷۴ھ

ابتدائی چار رسالوں اور " رسالہ مختصر حیوانات مطلق " کے ہمیں صرف نام معلوم ہوئے ہیں رسالہ مفتاح الافلاک نصیرالدین حیدر والئے اودھ کے حکم سے چھپا تھا ۔ اہل حیدرآباد کے نفع کی خاطر نواب فخرالدین خاں نے اسے اپنے سنگی چھاپہ خانہ میں چھپواکر تقسیم کیا ۔ اسی طرح رسالہ کیمسٹری پہلے آگرہ میں چھپا ۔ حیدرآباد کے طالب علموں کے فائدے کی غرض سے نواب صاحب موصوف نے اسے اپنے یہاں دوبارہ چھپوایا ۔

نواب فخرالدین خاں شمالی ہند کی علمی کوششوں سے واقف تھے ۔ برخلاف اس کے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ شمالی ہند والوں کو جنوب کے ترجموں سے واقفیت تھی ۔ یہاں اکثر اصطلاحات کے ترجمے کر لئے گئے تھے لیکن وہاں ترجموں میں زیادہ تر انگریزی اصطلاحات ہی مستعمل تھیں مثلاً ایسڈ کا ترجمہ یہاں کھٹہ کیا گیا تھا لیکن وہاں انگریزی اصطلاح ہی مستعمل تھی ۔ اسی طرح نیٹرک ایسڈ کو یہاں شورہ کا کھٹہ بولتے تھے لیکن شمال میں اصل اصطلاح ہی استعمال کی جاتی تھی ۔

نواب شمس الامرا نے اپنے پاس سے جو کتابیں شائع کیں ان کی زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہے ۔ برخلاف اس کے شمالی ہند کی جو کتابیں انھوں نے اپنے مطبع میں چھپوائیں اس قدر عام فہم

نہیں ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شمس الامرا کے مترجمین کو اپنے موضوعوں پر پورا پورا عبور حاصل تھا شمال کی زبان پر عربیت کا اثر زیادہ تھا مثلاً دکن میں ہیڈرو اسٹاٹکس اور اوپٹکس کا ترجمہ علی الترتیب علم آب اور علم انظار کیا گیا تھا ۔ اور شمال کے مترجمین نے علم الماء اور علم الانظار لکھا ہے ۔

سنہ شمسیہ کے دیباچہ عمومی میں نواب فخر الدین خاں نے لکھا ہے ۔" بندہ نیاز مند درگاہ ایزدی کا محمد فخر الدین خاں المخاطب بہ شمس الامرا اس طور پر گزارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہیں بہ سبب میلان طبیعت کے بہت اس طرف شوق رکھتا تھا میری سماعت میں آئیں ۔ اس جہت سے چند مسائل ان کے از بر تھے وہ اگرچہ بعضے علوم فلاسفہ زبان عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں چنانچہ علم جر ثقیل اور علم انظار وغیرہ مگر اس قدر نہیں ہیں کہ جیسا اب اہل فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجہ کمال اثبات کیا ہے ۔ بلکہ بعضے علوم اہل فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کا نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا چنانچہ علم آب اور ہوا اور برق اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ ۔ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصت قلیل میں اس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہووے کس واسطے کہ اگر بڑی بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالبوں کے ذہن پر اس کے مطالعہ کا بار ہوگا اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے ان کی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی پھر طالبین از خود ارادہ مبسوط کتابوں کے دیکھنے کا کریں گے ۔ چنانچہ ان دنوں میں بہ حسب مدعا چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بطریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے ریوری رنڈ چارلس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۸ء میں بیچ شہر لنڈن کے چھاپے گئے تھے بہم پہنچے ۔ ان میں سے رسالہ علم جر ثقیل اور علم ہئیت اور علم آب اور علم ہوا اور علم انظار کہ اس کے آخر میں مقناطیس کا رسالہ بھی شریک تھا اور علم برق کا کہ ہر ایک ان سے بدرجہ اوسط نہ بہت کم نہ بہت زیادہ لکھا ہوا تھا اور ہر چند ترجمہ ان علوم کا ہر ایک زبان میں قلمرو اہل فرنگ میں رواج پایا ہے مگر نظر کرتے فایدے ساکنان بلدہ فرخندہ بنیاد حیدر آباد ۔۔۔۔ میر امان علی دہلوی اور غلام محی الدین حیدر آبادی اور مسٹر جونس اور موسی تندوسی کو جو ملازمین

سرکار میں حکم کرنے میں آیا کہ ان علوم مذکور کو زبان انگریزی سے اُردو زبان میں ہمارے روبرو ترجمہ کریں چنانچہ بفضل حق سبحانہ تعالیٰ کے یہ چھ رسالے ترجمہ ہوئے مگر بعضے اسما انگریزی اصطلاح کے جو زبان عربی اور فارسی میں نہ میسر ہوئے ان کو اس زبان اصلی میں بحال رکھنے میں آیا اور یہ چھے رسالے جو ترجمہ کئے گئے چھے علم پر مشتمل ہیں اس واسطے نام ان کا ستہ شمسیہ رکھا گیا۔

- - - - - - - - - - - - - مادہ تاریخ اس رسالے کا گزرانا ہوا غلام محی الدین کا یہ ہے۔

ایں تالیف شمس الامرا

۱۲۵۵

ان علوم کے طالب علموں سے یہ امید ہے کہ وقت مطالعہ اس کتاب کے اگر کچھ سہو عبارت میں پا دیں تو اس کے اصلاح دینے میں دریغ نہ کریں - - - - "

جو زبان ان رسائل میں استعمال کی گئی ہے اس میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور ایسے الفاظ نظر آتے ہیں جو بعد میں متروک ہو گئے مثلاً دے آوے انھوں اور کبھو جملوں کی ترکیب اور ساخت کی قدامت کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"چھپوایا تھا بیچ لندن میں

واسطے سیکھنے اور دل لگی نوشبابوں کے۔

گولی جو مصنوع انسان کی ہے۔

گونج نہیں پیدا ہونے کی بغیر اس کے کہ - - - - - - - -

فہرست رسالہ علم آب مشتمل ہے اوپر دیباچہ اور بائیس گفتگو کے۔

جو جسم کہ اس کا ثقل پانی سے کم ہے"

معلوم ہوتا ہے کہ لکھنو اور دہلی کے ابتدائی زمانہ کے شاعروں کی طرح 'دے' کے استعمال میں انھوں نے بھی اپنے آپ کو پابند نہیں کیا۔

مثال ملاحظہ ہو۔

"استادوں نے دریافت کئے ہیں کہ"

بعض مقامات پر اسم کیفیت یا حاصل مصدر کے بجائے مصدر کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً

"ہوا کے دو جسموں کے تصادم سے گرجنا پیدا ہوتا ہے"

بعض جگہ داخل کرنا، دل لگی، امتحان اور صرف کرنا جیسے الفاظ کو ان معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن میں وہ اب مستعمل نہیں ہیں۔

شکر کو باسن میں داخل کرنا	(بمعنی ڈالنا)
واسطے سیکھنے اور دل لگی نوشنا بوں کے	(دلچسپی)
امتحانات بیان کئے گئے ہیں	(تجربے)
یہ آلہ پانی کو چڑھانے کی غرض سے صرف کیا جاتا ہے	(استعمال)

بعض الفاظ کا املا بھی قدیم ہے مثلاً

کورٹ کو "کوٹ" اور وہ کو "وہ" لکھا ہے۔

انگریزی الفاظ کے ہجا کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ ہیڈرجن کو کہیں "ھ" سے لکھا ہے اور کہیں "ح" سے۔

سائنس کی بعض اصطلاحات کے ترجمے کر لئے گئے ہیں اور بعض انگریزی تلفظ کے مطابق اُردو میں لکھے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

علم آب کی ترازو	Hydro Static Balance.
غوطہ زنوں کا آلہ	
پانی چڑھانے کا پمپ	
چوسنے کا پمپ	Sucking Pump.
زبردستی کا پمپ	Force Pump.

Microscope.	کلاں بین
Air Gun.	ہوا کی بندوق
	آلۂ تحلیل
	مدامی پون
Monsoon.	موسمی پون
	تبدیلی پون
	بخار کا آلہ
	نقشہ نویس کا صندوق
	قندیل سحر نما
	انحرافی دوربین
Reflecting Telescope.	منعکسی دوربین
	آئینہ ہزار چشمی
Parallel Rays.	موازی شعاعیں
Convergent Rays.	انقباضی شعاعیں
Divergent Rays.	انبساطی شعاعیں
Defracted Light.	انحرافی روشنی
Reflected Light.	منعکسی روشنی
Comet.	دنبالہ دار ستارہ

جن انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا ان میں سے بعض یہ ہیں :-

ہیڈرامیٹر

بیرامیٹر

تھرمامیٹر

بیرامیٹر

ہیگرامیٹر

ان کتابوں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ مندرجہ بالاخصوصیات کی حامل ہونے کے باوجود سادہ اور سلیس ہے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مباحث کے سمجھنے میں بھی عام پڑھنے والے کو کوئی دقت پیش نہیں آتی اس سے ظاہر ہے کہ ترجمہ کرنے والوں نے اصل کتاب کے مطالب کو پوری طرح اور خوبی کے ساتھ سمجھ لیا تھا اس لئے کسی مقام پر بھی معنوی تعقید یا گنجلک پیدا نہیں ہونے پاتی۔ عبارت میں ترجمہ پن نہیں پایا جاتا۔ افسوس کہ باوجود تلاش کے ریورنڈ چارس کی اصل کتابیں ہمیں نہیں مل سکیں اس لئے یہ نہیں تبلایا جا سکتا کہ ترجمہ اصل سے کہاں تک مطابق ہے۔ یہ کتابیں سوال و جواب کے طرز پر لکھی گئی ہیں اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

تعریفات اور کیفیات علم آب

" علم آب جس کو یونانی زبان میں ہیڈرس ٹاٹکس کہتے ہیں علم فلسفۂ طبیعی کی ایک نوع ہے جو طبیعت اور ثقل اور دباو اور حرکت اکثر سیال کی ظاہر کرتا ہے "

وہ اجزا کہ جن سے سیال بنا ہے فرض کئے ہیں کہ نہایت خرد اور کروی اور مصقل ہیں" اور یہ بھی فرض کیا گیا ہے کہ وے اجزا نہایت سخت اور بہت دبنے کے قابل نہیں ہیں۔ "جو جسم کہ اس کا ثقل پانی سے کم ہے اس قدر پانی میں ڈوبے گا کہ ایک مقدار آب اس جسم کے ٹکڑے کے برابر جو پانی کی سطح کے نیچے ہے اس کے تمام جسم کے ہموزن ہوگا" ہیڈرامیٹر کو شراب اتارنے کی جایون میں شراب کی قسمیں دریافت کرنے اور ان کا محصول مقرر کرنے کے کام میں لاتے ہیں "

"سفن ایک مدور نلی ہے"

"کوئے سے پانی کا چڑھنا چوسنے کے پمپ میں ہوا کے دباو سے ہوتا ہے اور ۳۲ فیٹ

تک چڑھتا ہے :"

" ہمیشہ پانی کی یکساں دھار دونوں نلوں میں کے ڈٹون کے متواتر حرکت کرنے سے حاصل ہوتی ہے :"

پہلی گفتگو

" تلمذ کلاں " تلمذ خرد ۔ حیدرواسٹاٹکس کمال لفظ ثقیل اور اجنبی ہے ۔ اکثر نام جو ان علوم میں آئے ہیں یونانی ہیں اور ہر لفظ دوسری زبان کا جب تک محاورے میں نہ آوے ثقیل معلوم ہوتا ہے اور اصل وضع سے بعضے نام کے معنی مفرد ہوتے ہیں اور بعضوں کے مرکب ۔ یہ نام دو لفظوں سے مرکب ہے ایک حیدرو جو اس زبان میں پانی کو کہتے ہیں دوسرا اسٹاٹکس مطلقاً اس علم کو کہتے ہیں جس سے ثقل و خفت اجسام کی معلوم ہوتی ہے ۔ چونکہ اس علم سے مقتضائے طبیعت تمام اجسام کا اور ثقل و خفت انھوں کی اور حرکت کرنا .... انھوں کا اور ترکیبیں اجسام غیر سیال کے وزن کرنے کی انھوں میں دریافت کرتے ہیں اس جہت سے اس علم کو حیدرو اسٹاٹکس یعنی علم آب کہتے ہیں :"

نواب شمس الامرا نے علم کیمیا کی بعض انگریزی کتابوں کا ترجمہ کروایا تھا ۔ کتب خانہ آصفیہ میں ہمیں " کیمسٹری کا مختصر رسالہ " ملا ۔ مصنف کا نام ریورنڈ جان ٹائم ہے ۔ کتاب قلمی ہے ۔ دیباچہ میں لکھا ہے ۔" یہ رسالہ مختصر علم کیمسٹری کا حسب الحکم حضرت نواب صاحب قبلہ نواب شمس الامرا بہادر امیر کبیر دام اقبالہ کے ترجمہ کیا گیا کہ جس میں تبدیل اور ترکیب عناصر اور چند اصول علم کیمسٹری کا بیان ہے اگرچہ اس علم میں بڑی بڑی کتابیں مع دلائل انگریزی زبان میں ہیں لیکن ساکنان فرخندہ بنیاد حیدرآباد کو بالکل آگاہی نہ تھی اس واسطے رورنڈ جان ٹائم صاحب کا مختصر رسالہ انگریزی زبان سے اردو عبارت میں لکھا گیا کہ تا ناواقف لوگوں کو کچھ کچھ اس علم کے اصطلاحات سے آگاہی ہووے اور یہ رسالہ مرتب ہوا نو باب اور سو امتحانات پر ۔ سنہ ۱۲۵۹ھ مطابق سنہ ۱۸۴۳ء :"

کتاب کے شروع میں اصطلاحات کے ترجموں کی فہرست بھی دی گئی ہے ۔

"نام دوائیوں کے انگریزی معہ ترجمہ"

سلفرک اسڈ	-	گندک کا کھٹہ
میورائیک اسڈ	-	کھانے نمک کا کھٹہ
نیٹرک اسڈ	-	شورے کا کھٹہ
آلوائیل	-	زیتون کا تیل
ٹرمرک	-	ہلدی
مرکری	-	پارا
سلفٹ آف کوپر	-	نیلا تھوتھا
نیٹرٹ آف پٹاس	-	شورہ
سوب برٹ آف سوڈا	-	سہاگہ
نٹریٹ آف سلور	-	سفوف نقرہ
نٹریٹ آف کاپر	-	تانبے کا شورہ
گولڈ لیف	-	سونے کے ورق
ٹرمرک پیپر	-	ہلدی کے پتے کے رس میں بھگایا ہوا کاغذ

بعض انگریزی اصطلاحات مثلاً سنتھی سس، انیلیس، سوڈیم پٹاسیم، وغیرہ کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"کیمسٹری وہ علم ہے کہ جس سے اجسام کا باہم عمل دریافت کیا جاتا ہے اور اس سے اجسام قدرتی کے اجزا نمود ہوتے ہیں خواہ حالت بساطت میں ہوں یا حالت ترکیب میں اس علم کے مرکبات کی ذات کو پہچاننے کے واسطے دو ترکیبیں ہیں چنانچہ سنتھس اور انلسس۔ سنتھس ایک لفظ ہے کہ اس کا معنی دو جسم یا زیادہ اجسام سے اتصال کیمسٹری حاصل کرنا ہے۔ اور انلسس وہ لفظ ہے کہ اس کا معنی ہر ایک جسم کو جدا کرنا اور جدی جدی حالت میں دکھلانا ہے۔"

یہ رسالہ کل سو" امتحانات" یعنی تجربوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کا حجم ۹۹ صفحے ہے۔
ایک تجربہ کا بیان ملاحظہ ہو۔

" ایک گرین (سوڈیم) اور ایک گرین (پٹاسیم) لے کر ایک چھوری کی نوک سے دونوں کو خوب ملاؤ بعدہ ایک قطرہ پارے کا ان کے نزدیک لے جاؤ۔ یہ دونوں جل جائیں گے اور ایک آنچ پیدا ہوگی۔

اس کتاب کی زبان میں بھی وہی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جو سنہ شمسیہ کی زبان کے متعلق بیان ہوئی ہیں۔ یعنی جملوں کی ترکیب اور ساخت قدیم ہے۔ اور جو نحوی غلطیاں اس زمانہ کی عام اردو کتابوں میں پائی جاتی ہیں وہی سب یہاں بھی نظر آتی ہیں۔ انداز بیان ایسا ہے کہ تمام مسائل بآسانی سمجھ میں آتے ہیں۔

اس کے دو سال بعد یعنی ۱۲۷۰ھ میں" رسالہ کیمسٹری شائع ہوا ابتدا میں حمد کے بعد لکھا ہے۔

" دانشوران ذی فہم پر پوشیدہ نہ رہے کہ یہ رسالہ ہے مختصر چند علوم کیمسٹری کے بیان میں کہ اس علم میں ترکیب عناصر کی حقیقت جو زبان فرنگ میں اس کو کہتے ہیں پائی جاتی ہے اور یہ علم بہت عجیب و غریب ہے کہ اس کی تحصیل اہل حکمت کو ضرور اور لازم ہے اور یہ علم اہل فرنگ کی زبان میں مندرج تھا لیکن حال میں ایک رسالہ اس علم کا ہندوستان سے شہر آگرے کا چھپا ہوا ایسا آیا تھا کہ اس میں ایک صفحہ انگریزی زبان کا اور دوسرا صفحہ اس کے ترجمہ کا اردو زبان میں لکھا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ دوبارہ محتاج چھاپے کا نہ تھا مگر یہاں طالبوں کے فائدہ کے لئے اس کے اردو ترجمے کو علیحدہ لکھوا کر چھپا گیا۔"

اس کتاب کی زبان میں وہ سادگی اور روانی نہیں پائی جاتی جو" کیمسٹری کا مختصر رسالہ" میں پائی جاتی ہے۔ بہتیری انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا اس وجہ سے جگہ جگہ انگریزی الفاظ عبارت میں نظر آتے ہیں انھیں اسی طرح رکھ کر مفہوم سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:-

ڈکامپزیشن

الیکٹرسٹی

نیٹرک آسڈ

تھرمامیٹر

کنڈکٹر

نان کنڈکٹر (بعض مقامات پر نن کنڈکٹر بھی لکھا ہے)

پسٹن

سلنڈر

کاسٹک

میگنشیا

جن اصطلاحات کا ترجمہ کیا گیا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:-

قوت جاذبہ۔ خواہش رغبت محبت	Attraction.
قلم	Crystal.
مہوس	Chemist.
جامد	Solid.
سیال	Liquid, Fluid.
ہوائی	Gas.
سنگ چقماق	
گھلنے کی خاصیت	Solubility.
بچون	Iron filings.
شعلہ گیر۔	Inflamable.

سہاگہ	Borax.
نشاستہ	Starch.
سرش	
گلٹی	
حرارت	Heat.

اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ کتاب "بطریق مکالمہ" لکھی گئی ہے۔ اصل انگریزی کتاب اور مصنف کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ اس کا بھی کہیں ذکر نہیں کیا گیا کہ ترجمہ کس شخص یا جماعت نے کیا۔

سوال۔ کس طرح معلوم کیا جاتا ہے کہ فلانی چیز اسڈ ہے یا نہیں۔

جواب۔ پہلے مزیسے دوسرے یہ کہ جتنی نیلی چیز نباتاتی اس میں ڈالی جاوے ان کو سرخ کردیتا ہے۔

سوال۔ سلفورک اسڈ کیا کام آتا ہے۔

جواب۔ رنگین کپڑے کو جو سفید کیا چاہیں تو بھی اس کی دوا ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ تین حصے پانی میں اس کا ایک حصہ ملا دیا جاوے تو اس کی گرمی تین سو درجے تک تھرمامیٹر کے ہوتی ہے۔ تو کھولتے پانی کی گرمی سے اس کی گرمی سوم حصہ زیادہ ہے اور اس کے سبب سے جو ہیڈروجن گاس نکلتا ہے اس کی ترکیب آگے ہی لکھی گئی ہے"

ایک اور مقام سے تھوڑی سی عبارت نقل کی جاتی ہے۔

" سوال۔ ڈیکامپزیشن کے کیا معنی ہیں۔

جواب۔ کسی مرکب کے اجزائے بسیط کو جدا کرنا۔ مثلاً ایک روٹی لو اور اس میں جو میدا خمیر نمک پانی ہے ان کو ایک دوسرے سے جدا کرو۔ یہی ڈیکامپزیشن کہلاتا ہے اسی طرح آب و آتش خاک و باد ہر ایک ان میں سے ڈیکامپزیشن ہوسکتا ہے۔

سوال۔ اگر یہ سب مرکب ہیں تو کونسی چیز بسیط ہے۔

جواب ۔ یوں تو پچاس ساٹھ چیزیں بسیط ہیں پر یہاں چاروں مفرد نہیں چنانچہ ہوا دو چیزوں سے مرکب ہے یعنی آکسیجن اور نیٹرجن اس کا بیان مفصل آگے ہوگا ۔

نواب فخر الدین خاں کے فرزند عمدۃ الملک نواب رفیع الدین خاں نے مغربی اور جدید ترین علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کیں ۔ ان کے ایما سے رسالہ علم ہندسہ ۱۲۵۱ھ رفیع الحساب ۱۲۵۲ھ رفیع البصر رفیع الصنعت اور رفیع التراکیب ۱۲۸۴ھ جیسی متعدد کتابیں شائع ہوئیں لیکن ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ یہ تصانیف ہیں یا تراجم رفیع الدین خاں کی بعض کتابیں ان کے والد نواب فخر الدین کی زندگی میں شائع ہوئیں ۔

نواب ابوالخیر خان بہادر نامور جنگ شمس الامرا کے حکم سے ۱۲۸۰ھ میں جان مارٹس ساکن حیدرآباد نے الیمانی ہانیمن صاحب کی ایجاد " رسالہ ہومیو پاتک " کا ترجمہ کیا ۔ یہ کتاب مطبع رحمانی حیدرآباد میں چھپی ہے ۔ اور ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔

ترجمہ کی عبارت فارسی آمیز ہے ۔ نمونہ ملاحظہ ہو ۔

حق تعالیٰ عز شانہ نے انسان ضعیف البیان کو عقل سے مکمل کیا اور ضرورت اور منفعت کے صدہا فوائد بخشے جس کے سبب بنی آدم کا رتبہ اشرف المخلوقات ہے ۔ انسان بیماری دور کرنے کے لئے قوت کسیف اور معین اپنے اندر رکھتا پس اس عقل پر واجب ہے کہ جسم کے امراض دفع کرنے سریع التاثیر اور قوی العمل کے علاج کو معلوم کرے جو مشیت ایزدی سے اس کے وجود میں مطلقاً نہیں ہے ۔ لیکن جب یہ بات ہم کو قدرت سے مرحمت نہیں ہوئی تو اس طبیعت کو ہمارے حاجتوں کے لئے کافی نہ جاننا چاہئے ۔ بلکہ بہبودی اور خورمی کے واسطے عقل کے خزانے کو لاتعین طور سے صرف کرنا ضرور ہے

شاہان اودھ

اس عہد میں اردو ترجموں کا تیسرا اور آخری مرکز لکھنو تھا ۔ شاہان اودھ نے لکھنو میں جدید مغربی علوم و فنون کی بعض کتابوں کے ترجمے کرائے جو مطبع سلطانی میں چھپ کر شائع ہوئے ۔

سید کمال الدین حیدر لکھنوی نے جدید علوم پر انیس رسالوں کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں کیا۔ ان میں سے بعض کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) رسالہ ہیئت مصنفہ ڈاکٹر روسن

(۲) رسالہ دیگر ہیئت مصنفہ ڈاکٹر برنکلی

(۳) رسالہ علوم طبعیہ (فزکس)

(۴) رسالہ قوت مقناطیس

(۵) رسالہ علم الکیمیا

(۶) رسالہ علم المناظر

(۷) رسالہ علم الماء

(۸) رسالہ علم الہوا

(۹) رسالہ علم الحرارۃ

(۱۰) رسالہ مقاصد العلوم مصنفہ لارڈ بروم

آخر الذکر کتاب یعنی رسالہ مقاصد العلوم لارڈ بروم کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۴۲ء میں مطبع سلطانی میں طبع ہوا۔ اس میں مختلف علوم کے فوائد اور ان کے مقاصد اور موضوعوں کی تشریح کی گئی ہے۔ کتاب کے شروع میں مترجم نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے ......

"حسب الحکم ابو الفتح معین الدین سلطان الزماں نوشیرواں عادل محمد علی شاہ بادشاہ غازی حسب فرمائش محکمہ اجلاس جنرل کلسٹی (کمیٹی) اسکول بک سوسائٹی کے عاصی سراپا معاصی سید کمال الدین حیدر عرف محمد میر الحسنی الحسینی نے زبان اُردو میں ترجمہ کیا" باوجود انتہائی کوشش کے مندرجہ بالا فہرست کی کوئی کتاب ہمیں نہیں مل سکی اس لئے ترجمہ کے صحت وسقم اور زبان کی خصوصیتوں سے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا جا سکتا۔ البتہ کمال الدین حیدر کے ایک ترجمہ کا ذکر تفصیلی طور پر دہلی کالج کی مطبوعات کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔

انفرادی کوششیں

گذشتہ صفحات میں ہم نے صرف اجتماعی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ مختلف افراد نے انفرادی طور پر جو ترجمے شائع کرائے ان میں اکثریت تاریخی کتابوں کی ہے۔ ایک ترجمہ ۱۷۴۹ء میں چھپا جس کا نام "قاصدین سوپولوس رومین والیان کون لیکھنے چین سوکا غذ ہے" نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب دکنی زبان میں ہے۔

۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۲ء تک یعنی بیالیس سال کے عرصہ میں جو ترجمے شائع ہوئے ان میں حسب ذیل مطبوعات شامل ہیں۔

ٹائٹلر کی ایلیمنٹس آف جنرل ہسٹری کا ترجمہ ایل ڈی کا سٹا نے ۱۸۲۹ء میں جو کلکتہ سے شائع ہوا۔ "تاریخ انگلینڈ کی" ۱۸۴۰ء میں مدراس میں چھپی۔ ڈاکٹر گولڈ سمتھ کی کتاب کا اردو ترجمہ "تاریخ روم" کے عنوان سے ۱۸۴۱ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ "تاریخ ملک چین" جیمس کورکورن کی تاریخ کا ترجمہ ۱۸۴۱ء میں بہ مقام کلکتہ شائع ہوا۔ مشہور انگریزی ناول نگار جان بنیان کے مشہور ناول پلگرمس پروگرس کا ملخص ترجمہ ۱۸۳۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے دوسرے سال یعنی ۱۸۳۹ء میں سید محمد میر نے مشہور انگریزی ادیب ڈاکٹر جانسن کے ناول راسلس کا ترجمہ "قصہ راسلس ولایت حبش کے شہزادے کا" کے عنوان سے کیا۔ ۱۸۳۵ء میں "داؤد کے زبور" سرام پور سے شائع ہوئی۔ راجہ کالی کرشنا بہادر نے مسٹر گے کے فیبلس کا ترجمہ ۱۸۳۶ء میں کلکتہ میں شائع کیا۔ ۱۸۴۲ء میں "خلاصہ علم الارض" کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی۔

ابابیل

اس کا نام تو رحیم خاں تھا مگر اس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو۔ گاؤں بھر اس کے نام سے کانپتا تھا۔ نہ آدمی پر ترس کھائے نہ جانور پر۔ ایک دن رامو لہار کے بچے نے اس کے بیل کی دم میں کانٹے باندھ دیئے تھے تو مارتے مارتے اس کو ادھ موا کر دیا۔ اگلے دن ذیلدار کی گھوڑی اس کے کھیت میں گھس آئی تو لاٹھی لے کر اتنا مارا کہ لہو لہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ کمبخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں ہے۔ معصوم بچوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنم میں جلے گا۔ مگر یہ سب اس کی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا تھا۔ سامنے کسی کی ہمت زبان ہلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو کی جو شامت آئی تو اس نے کہدیا "ارے بھئی رحیم خاں تو کیوں بچوں کو مارتا ہے"۔ بس اس غریب کی وہ درگت بنائی کہ اس دن سے لوگوں نے بات بھی کرنی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ پڑے بعض کا خیال تھا کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اس کو پاگل خانے بھیجنا چاہئے۔ کوئی کہتا تھا اب کے کسی کو مارے تو تھانے میں رپٹ لکھوادو۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف گواہی دے کر اس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صبح سویرے وہ ہل کاندھے پر دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔ راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں جاکر بیلوں سے آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اس نے دونوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک کو کہتا تھا 'نتھو' دوسرے کو 'چھدو'۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا "کیوں بے 'نتھو' تو سیدھا نہیں چلتا۔ یہ کھیت آج تیرا باپ پورا کرے گا۔ اور ابے چھدو تیری بھی شامت آئی ہے کیا" اور پھر ان غریبوں کی شامت آہی جاتی۔ سوت کی رسی کی مار۔ دونوں بیلوں کی کمر پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو وہاں اپنے بیوی بچوں پر غصہ اتارتا۔ دال یا ساگ میں نمک کم ہے، بیوی کو

ادھیڑ ڈالا۔ کوئی بچہ شرارت کر رہا ہے، اس کو الٹا لٹکا کر بیلوں والی رسی سے مارتے مارتے بیہوش کر دیا۔ غرض ہر روز ایک آفت بپا رہتی تھی۔ آس پاس کے جھونپڑوں والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں اور اس کی بیوی اور بچوں کے مار کھانے اور رونے کی آواز سنتے مگر بیچارے کیا کر سکتے تھے اگر کوئی منع کرنے جائے تو وہ بھی مار کھائے۔ مار کھاتے کھاتے بیوی غریب تو ادھ موئی ہو گئی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں ساٹھ کی معلوم ہوتی تھی۔ بچے جب چھوٹے چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تو ایک دن مار کھا کر جو بھاگا تو پھر واپس نہ لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں ایک رشتہ کا چچا رہتا تھا اس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا "ہلاس پور کی طرف جاؤ تو ذرا نور دو کو لیتے آنا" بس پھر کیا تھا آگ بگولہ ہو گیا۔ "میں اس بدمعاش کو لینے جاؤں۔ اب وہ خود بھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا"

وہ بدمعاش کیوں موت کے منہ میں واپس آنے لگا تھا۔ دو سال کے بعد چھوٹا لڑکا بندو بھی بھاگ گیا۔ اور بھائی کے پاس رہنے لگا۔ رحیم خاں کو غصہ اتارنے کے لئے فقط بیوی رہ گئی تھی سو وہ غریب اتنی پٹ چکی تھی کہ اب عادی ہو چلی تھی۔ مگر ایک دن اس کو اتنا مارا کہ اس سے بھی نہ رہا گیا اور موقع پا کر جب رحیم خاں کھیت پر گیا ہوا تھا وہ اپنے بھائی کو بلا کر اس کے ساتھ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ ہمسایہ کی عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں چند روز کے لئے اپنی ماں کے پاس رام نگر جا رہی ہوں۔

شام کو رحیم خاں بیلوں کو لئے واپس آیا تو پڑوسن نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اس کی بیوی اپنی ماں کے ہاں چند روز کے لئے گئی ہے۔ رحیم خاں نے خلاف معمول خاموشی سے بات سنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی بیوی اب کبھی نہ آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر جھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ کوئی اور نظر نہ آیا تو اس کی ہی دم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔ چولھے کو جا کر دیکھا تو ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا۔ بغیر کچھ کھائے پئے ہی پڑ کر سو رہا۔

اگلے دن رحیم خاں جب سو کر اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ لیکن آج اسے کھیت پر جانے کی جلدی نہ تھی۔ بکریوں کا دودھ دھو کر پیا اور حقہ بھر کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب جھونپڑے میں دھوپ بھر آئی تھی۔ ایک کونے میں دیکھا تو جالے لگے ہوئے تھے۔ سوچا کہ لاؤ صفائی ہی کر ڈالوں۔ ایک بانس میں کپڑا باندھ کر جالے اتار رہا تھا کہ کھپریل میں ابابیلوں کا ایک گھونسلہ نظر آیا۔ دو ابابیلیں کبھی اندر جاتی تھیں کبھی باہر آتی تھیں پہلے اس نے ارادہ کیا کہ بانس سے گھونسلہ توڑ ڈالے۔ پھر معلوم نہیں کیا سوچا۔ ایک گھڑونچی لا کر اس پر چڑھا اور گھونسلے میں جھانک کر دیکھا۔ اندر دو لال بوٹی سے بچے پڑے چوں چوں کر رہے تھے۔ اور ان کے ماں باپ اپنی اولاد کی حفاظت کے لئے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ گھونسلے کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مادہ ابابیل اپنی چونچ سے اس پر حملہ آور ہوئی۔

"اری، آنکھ پھوڑ گی ا" اس نے اپنا خوفناک قہقہہ مار کر کہا۔ اور گھڑونچی پر سے اتر آیا۔ ابابیلوں کا گھونسلہ سلامت رہا۔

اگلے دن سے اس نے پھر کھیت پر جانا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں میں سے اب بھی کوئی اس سے بات نہ کرتا تھا۔ دن بھر ہل چلاتا، پانی دیتا یا کھیتی کاٹتا۔ لیکن شام کو سورج چھپنے سے کچھ پہلے ہی گھر آ جاتا۔ حقہ بھر کر پلنگ کے پاس لیٹ کر ابابیلوں کے گھونسلے کی سیر دیکھتا رہتا۔ اب دونوں بچے بھی اڑنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس نے ان دونوں کے نام اپنے بچوں کے نام پر نورو اور بندو رکھ دئے تھے۔ اب دنیا میں اس کے دوست یہ چار ابابیل ہی رہ گئے تھے۔ اس کے ہمسائے اس سے اب بھی خائف تھے۔ اس کی خاموشی کو وہ شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن ان کو یہ حیرت ضرور تھی کہ مدت سے کسی نے اس کو اپنے بیلوں کو مارتے نہ دیکھا تھا۔ نھو اور چھدو خوش تھے۔ ان کی کمروں پر سے زخموں کے نشان بھی تقریباً غائب ہو گئے تھے۔

رحیم خاں ایک دن کھیت سے ذرا سویرے چلا آ رہا تھا کہ چند بچے سڑک پر کنڈی کھیلتے ہوئے ملے۔ اس کو دیکھنا تھا کہ سب اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ کہتا ہی رہا "ارے میں کوئی مارتا

تھوڑا ہی ہوں۔" آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی بیلوں کو ہنکاتا ہوا گھر لایا۔ ان کو باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہو گئی۔

اندر آکر کواڑ بند کئے اور چراغ جلا کر اجالا کیا۔ حسب معمول باسی روٹی کے ٹکڑے کر کے ابابیلوں کے گھونسلے کے قریب ایک طاق میں ڈالدئے۔ "ارے او بندو۔ ارے او نورو" پکارا مگر وہ نہ نکلے۔ گھونسلے میں جو جھانکا تو چاروں اپنے پروں میں سر دئے سہمے بیٹھے تھے۔ عین جس جگہ چھت میں گھونسلہ تھا وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر یہ پانی اس طرح ہی آتا رہا تو گھونسلہ تباہ ہو جائے گا اور ابابیلیں بے چاری بے گھر ہو جائیں گی۔ یہ سوچ کر اس نے کواڑ کھولے اور موسلا دھار بارش میں سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گیا۔ جب تک مٹی ڈال کر سوراخ کو بند کر کے وہ اترا تو شرابور تھا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں۔ مگر اس نے پرواہ نہ کی اور گیلے کپڑوں کو نچوڑ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح کو اٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا۔ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اس کو کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو تشویش ہوئی۔ کالو زمیندار اور کئی کسان شام کو اس کے جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو وہ پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا۔ "ارے بندو۔ ارے نورو۔ کہاں مر گئے۔ آج تمھیں کون کھانا دے گا" چند ابابیل کمرے میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

"بیچارہ پاگل ہو گیا ہے" کالو زمیندار نے سر ہلا کر کہا "صبح کو شفا خانہ والوں کو پتہ دیدیں گے کہ پاگل خانہ بھجوا دیں"

اگلے دن صبح کو جب اس کے پڑوسی شفا خانہ والوں کو لے کر آئے اور اس کے جھونپڑے کا دروازہ کھولا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کی پائینتی چار ابابیلیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔

دنیا میں ذخیرۂ غذا

(ذیل کا مضمون "الہلال" (مصر) کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے)

دنیا کی آبادی تقریباً ایک ہزار آٹھ سو ملین ہے۔ کرۂ ارض میں خشکی کا رقبہ، منطقۂ قطبی کے خشکی حصہ کو علیحدہ کر لینے کے بعد ۳۳ ہزار ملین ہے۔ اور اس کا نصف حصہ مشکل سے کاشت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ معاشیین کا خیال ہے کہ فی شخص پانچ ایکڑ زمین زیست کے لئے کافی ہے۔ تو گویا اگر کرۂ ارض کے تمام خشک حصے، کاشت کے قابل بنا لئے جائیں تو چھ ہزار ملین آبادی کی گذراوقات کے لئے کافی ہوں گے۔ اور اگر صنعت و زراعت کی موجودہ ترقی قائم رہی تو چھ ہزار ملین نفوس کرۂ ارض پر نہایت سہولت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گے۔

انیسویں صدی کے دو بڑے ماہر اقتصادیات ___ ریکارڈو اور مالتھس کا خیال تھا کہ اس وقت انسان نے اگرچہ پیداوار کے بڑھانے کے لئے مختلف سینٹیفک وسائل ایجاد کر لئے ہیں لیکن اس کے باوجود پیداوار، آبادی کی بڑھتی ہوئی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ صنعتی وسائل بہ نسبت زرعی وسائل کے زیادہ ترقی پذیر ہیں ___ انسان نے زراعت سے زیادہ صنعت کی طرف توجہ کی اور اسے ترقی کے آخری زینہ تک پہونچا یا لیکن ان کا یہ خیال تمام ممالک کے لئے صحیح نہیں ہو سکتا۔ ولایات متحدہ میں زراعت کو جس قدر فروغ حاصل ہے وہ صنعت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کو بہت حد تک ابھی ترقی دینے کی گنجائش ہے۔ وہاں کے ماہرین زراعت ہر طریقہ سے زرعی پیداوار کو ترقی دینے اور اس کو آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں سوچنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ زمین کے تمام خشک حصے کو قابل زراعت بنا لینا توسیع زراعت کے سلسلہ میں آخری اقدام ہے۔ کیونکہ سائنس، زراعت کی ترقی کے لئے روزانہ جدید وسائل دریافت کرتی رہتی ہے، جو زمین کی پیداوار اور غلہ کی

زیادتی میں بہت معین ثابت ہوئے ہیں اگر سائنس کے یہ اکتشافات ایز اونیل کے ساتھ قائم ہے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آبادی میں چاہے جس قدر بھی اضافہ ہو جائے مگر خوراک کبھی کم نہیں ہو سکتی۔

دنیا میں ذخیرۂ طعام کی مختلف قسمیں ہیں۔ جنھیں حسب ذیل طریقہ پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ غلّہ ۔ مثلاً گیہوں، چاول

۲۔ ترکاری ۔ مثلاً لوبیا، سیم

۳۔ نبات ۔ مثلاً گنا، آلو

۴۔ روغن دار تخم ۔ مثلاً تخم روئی، تل

۵۔ بری حیوانات ۔ مثلاً بکری، گائے، طیور

۶۔ آبی حیوانات ۔ مثلاً مچھلی وغیرہ

یہی ذخیرۂ خوراک ہے جسے زیادہ تر لوگ استعمال کرتے ہیں اور جن پر ہم آگے چل کر اختصار کے ساتھ ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کریں گے۔ لیکن اسے ملحوظ رکھنا چاہئے کہ بہت سے ایسے اسباب بھی ہیں جن کا ذخیرۂ خوراک اور پیداوار پر بہت کچھ اثر پڑتا ہے۔ مثلاً (۱) قابلیت زمین (۲) زراعتی معلومات (۳) اسباب زندگی (۴) ایک جگہ سے دوسری جگہ خوراک کے نقل و حرکت کے وسائل (۵) آبادی سے مرکز غذا کا قرب و بعد۔

قارئین کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہو سکتا ہے کہ اقسام خوراک میں ہم نے پھلوں کا کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر پھلوں کو غذا میں شمار نہیں کیا جاتا اور عموماً بطور غذا کے استعمال بھی نہیں ہوتے۔

۔ غذاؤں میں سب سے زیادہ اہمیت غلہ کو حاصل ہے درحقیقت یہ انسان کی توجہ کا بہت زیادہ مستحق بھی ہے کیونکہ اس میں کالوری (گرمی کی مقدار) بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ولایات متحدہ کے باشندے غلہ ہی کو اپنی مستقل اور اصلی غذا خیال کرتے ہیں۔ اور مشرق کی تو ایک بڑی جماعت کی غذا کا انحصار محض غلہ پر ہے بخصوصیت کے ساتھ گیہوں، چاول، باجرہ، جو،

جئی، اور جاویدار (Rye) کو تو ان کی غذا میں بہت دخل ہے۔

دنیا میں غلہ کی پیداوار کا ہم ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتے کیونکہ مشرقی ممالک کی پیداوار یکسر غیر معروف ہے۔ مگر علمار اقتصادیات نے حسب ذیل مقدار میں اندازہ لگایا ہے۔

گیہوں		ایک ہزار ملین	اردب[1]
جاویدار	(Rye)	چار سو	" "
باجرہ		ایک ہزار ملین	اردب
جئی	(oats)	"	" "
جو		چار سو	" "
چاول		ایک ہزار	" "
دوسرے اقسام کے غلے		چھ سو	" "

ان تمام کا مجموعہ تقریباً پانچ ہزار چار سو اردب ہوتا ہے۔ اور یہ مقدار تقریباً ہر سال پیدا ہوتی ہے ہم ابتدا میں بتا چکے ہیں کہ کل آبادی اٹھارہ ہزار ملین ہے تو گویا فی کس سالانہ ۳ اردب کا اوسط ہوتا ہے اور یہ مقدار ایک شخص کے لئے نہ صرف کافی بلکہ زیادہ ہے۔

غلوں کی پیداوار کا انحصار مختلف اسباب پر ہے جنہیں محنت اور مصارف کی کمی کو بہت دخل اور اہمیت حاصل ہے۔ اسی بنا پر جہاں جس کی کاشت میں سہولتیں زیادہ حاصل ہیں اور مزدوری کم لگتی ہے وہاں اس کی کاشت بہت زیادہ ہے مثلاً مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان اور چین میں چاول کی پیداوار بہت کافی ہوتی ہے۔ اگر وہ تمام وسائل جو غلہ کی پیداوار کے ضمن میں استعمال ہو سکتے ہیں، کام میں لائے جائیں تو موجودہ مقدار میں حیرت انگیز اضافہ ہو سکتا ہے۔

۲- غذا کی دوسری قسم میں ترکاری داخل ہے ـــــ ترکاری قدیم زمانہ سے انسان کی

[1] ستر سیر ۱۶ تولہ کا ایک پیمانہ ہوتا ہے۔

غذا ہے۔ افسوس کہ اس کی پیداوار کا ہمیں صحیح طور پر علم نہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اکثر مشرقی ممالک نے اس کی زراعت کو کسی خاص طرح پر منظم نہیں کیا ہے اس کی علت غالباً یہ ہے کہ بہ نسبت غلہ وغیرہ کے اس کی تجارت میں بہت سی دشواریاں اور مشکلات ہیں اور اس میں نقصان کا بھی بہت زیادہ امکان ہے۔

یہ بالکل واضح ہے کہ ترکاریوں میں عموماً پروٹین (نشاستہ) اور دہنیت کی مقدار بہت کافی ہوتی ہے اس لئے اس میں اس بات کی پوری صلاحیت ہے کہ وہ گوشت کی قائم مقام بن سکے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جن ممالک کی آبادی زیادہ ہے وہاں ترکاری کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے اگر آپ ہندوستان، چین، جاپان اور ان دیگر ممالک کو بغور دیکھیں جہاں آبادی بہت زیادہ ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں ترکاری کی کاشت کو نہایت سرعت کے ساتھ فروغ حاصل ہو رہا ہے اور وہاں ترکاری بتدریج گوشت کی جگہ حاصل کر رہی ہے۔ مشرق میں ترکاری کی کثرت کی ایک سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کی بعض قومیں خصوصاً ہندوؤں کی بعض جماعتیں گوشت کا کھانا بالکل حرام سمجھتی ہیں اور وہ اس کمی کو غلہ اور ترکاریوں سے پوری کرتی ہیں۔ چین میں بھی ترکاری بہت کثرت سے استعمال کی جاتی ہے مگر اس کی وجہ گوشت کی گرانی اور ترکاری کی ارزانی ہے یعنی اقتصادی حالات نے ترکاری کے استعمال اور گوشت کے ترک پر مجبور کیا۔ آج کل بعض یورپین قومیں بھی چینی سیم (Soy Beans) کی کاشت پر بہت زیادہ توجہ مبذول کر رہی ہیں کیونکہ اس میں غذائیت اور پروٹین بہت کافی مقدار میں پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ نہایت آسانی سے گوشت کی قائم مقام ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ بہت زیادہ ارزاں ہوتی ہے جسے غربا بھی بغیر کسی زحمت کے استعمال کر سکتے ہیں۔

علمی اور زرعی تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ ایک ایکڑ زمین کے غلہ میں پروٹین کی جو مقدار ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ اتنی ہی زمین کی پیدا کردہ ترکاری میں ہوتی ہے۔ اسی بنا پر یورپ میں غذا کی کمی اس قدر واقع نہیں ہوتی جتنی چین وغیرہ میں پائی جاتی ہے

اور نہ ایک طویل مدت کے لئے اس قسم کا خطرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یورپ زرعی کے بجائے صنعتی ملک ہے۔ اس لئے اس کی غذا ترکاری کے بجائے زیادہ تر گوشت ہے لیکن وہ ممالک جو اپنی مصنوعات اور غلے کی نکاسی پر قدرت نہیں رکھتے ان کی کوشش عموماً یہ ہوتی ہے کہ اپنے یہاں کی مروجہ غذا کی کاشت کو بہتر سے بہتر طریقہ پر منظم کریں۔

۴۔ تیسری قسم میں ہم نے نبات کو رکھا ہے۔ اس میں گنا، چقندر، آلو اور گاجر وغیرہ داخل ہیں۔ ان میں نشاستہ اور کاربوہائی ڈریٹ (Carbohydrates) بہت زیادہ ہوتی ہے اور پروٹین اور دہنیت سے بالکل پاک ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ غذائیت میں کسی طرح کم نہیں ہوتیں دوسرے یہ کہ یہ کبھی شاذ و نادر ہی خراب ہوتی ہیں۔

گنے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جنگ عظیم سے قبل شکر کی پیداوار دنیا بھر میں ۱۸ ملین ٹن تھی۔ مگر اب اس کی پیداوار ۲۵ ملین ٹن ہے جس میں سے ۱۶ ملین ٹن گنے سے تیار ہوتی ہے بقیہ —— ۹ ملین ٹن —— چقندر سے۔ لیکن جنگ عظیم نے بالکل کایا پلٹ دی۔ یہ گنے کے حق میں بہت زیادہ مفید اور چقندر کے حق میں سم قاتل ثابت ہوئی۔ مگر اب اس میں تغیر ہو چلا ہے۔ چقندر کی کاشت اپنی پہلی حالت کی طرف واپس آ رہی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اقالیم معتدلہ میں۔

بہر حال ان دونوں کی کاشت کے لئے میدان بہت زیادہ وسیع ہے انھیں اس قدر ترقی دی جا سکتی ہے کہ موجودہ آبادی کے دس گنا اضافہ کے لئے کفایت کر سکتی ہیں۔ و نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلا سال ختم نہ ہوگا کہ دوسرے سال شکر کی مقدار ترقی کر کے ۳۰ ملین تک پہونچ جائے گی۔

آلو کو غذا میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ ہر جگہ عموماً اور یورپ و شمالی امریکہ میں خصوصاً بہت استعمال کیا جاتا ہے حتیٰ کہ تقریباً دسترخوان کے لوازمات سے ہو گیا ہے گذشتہ سال اس کی پیداوار تقریباً ۱۲۰ ٹن تھی (واضح رہے کہ روسی پیداوار اس میں داخل نہیں ہے جس کی مقدار بہت کافی ہے) اور یہ عجیب بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں آلو کا جس قدر رواج ہے مشرقی

اقوام میں اسی قدر ناپید ہے۔ حالانکہ یہ بہت ہی زود ہضم ہوتا ہے، اس میں نشاستہ، شکر اور اسپرٹ (روح) کافی مقدار میں ہوتی ہے۔ اور انسان و حیوان دونوں کے لئے عمدہ اور طاقت ور غذا ہے۔ اس کی کاشت اوائل عہد سے قائم ہے اور اس میں ابھی اس قدر ترقی کی گنجائش ہے کہ ڈیڑھ سو برس میں یا موجودہ آبادی کی آٹھ گنا تعداد کی غذا کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔

۴۔ چوتھی قسم میں وہ تخم یا دانے (حبوب) داخل ہیں جن میں تیل ہوتا ہے مثلاً السی، تل وغیرہ ان میں پروٹین بہت ہوتی ہے مگر نشاستہ نام کو نہیں ہوتا اور اس کے باوجود غذائیت کے لحاظ سے عام غلہ سے بہتر ہوتے ہیں۔ ان کا استعمال غلہ اور ترکاری کے مقابلہ میں بہت کم ہے لیکن ظن غالب ہے کہ مستقبل قریب میں یہ کافی رائج ہوں گے کیونکہ یہ انسان و حیوان دونوں کی غذا بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان میں روغن کثرت سے ہوتا ہے جسے کھانا بنانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے گو اطلاعات اس کی ترقی کی تائید میں نہیں ہیں لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ غذا کا عظیم الشان ذخیرہ ہے جسے فروغ دے کر موجودہ انسانی تعداد کی کئی گنا آبادی کی خوراک کا سامان کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ پانچویں قسم میں پالو بری حیوانات داخل ہیں۔ گو عدم شماری کی بنا پر ان حیوانات کی تعداد کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے جن کا گوشت غذا کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر پھر بھی بلا خوف کہا جا سکتا ہے کہ غذا کی یہ قسم بہت بڑی آبادی کے لئے کافی ہے۔ حیوانات کو غذا کے لحاظ سے بھی بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن افسوس کہ عام طور پر اس کی حفاظت کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک سے زائد مرتبہ اس قسم کے واقعات پیش آئے ہیں کہ بعض حیوانات کے بالکل ختم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ جنگ عظیم میں بعض جانور خصوصاً گھوڑے، خچر (بعض ممالک میں ان کا گوشت کھایا جاتا ہے) بالکل ختم کے قریب ہو گئے تھے۔ مگر جنگ کے بعد پھر اپنی سابق حالت پر واپس آ گئے۔

علما نے اہم حیوانات کی تعداد کا حسب ذیل، تخمینہ کیا ہے۔

گھوڑے، خچر اور گدھے	۱۴۰ راس

گائے	۵۸۰	راس
خنزیر	۲۰۰	″
بھیڑ بکری	۸۶۰	″
اونٹ اور بھینس	۶۰	″

اس میں شبہ نہیں کہ یہ تعداد محض تخمینہ اور اندازہ ہے اسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو موجودہ آبادی کی دو چند تعداد کے لئے محض یہی کافی ہیں۔

حیوانات کا خرچ، آسٹریلیا، ارجنٹائن، کناڈا اور ولایات متحدہ میں حسب ترتیب ہے ایشیا میں اس کا سب سے کم خرچ ہے کیونکہ اس میں لاکھوں کا تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بعض حیوانات کے کھانے کو جائز ہی نہیں سمجھتے۔ مذہب کو درحقیقت گوشت کے بارے میں بہت دخل ہے مثلاً اسلام اور یہودیت میں خنزیر اور بعض دوسرے حیوانات کا کھانا مطلق حرام ہے۔ ہندو دھرم عام طور پر حیوانات کے خون کرنے کے خلاف ہے حتیٰ کہ بعض فرقے محض اس بنا پر اپنا منہ کھلا ہوا نہیں رکھ سکتے کہ سانس کے ساتھ بہت سے کیڑوں کی جان کا خطرہ ہے۔ جاپان میں عام طور پر مچھلی کو دیگر حیوانات پر ترجیح حاصل ہے۔ بہرحال غذا کی یہ قسم ایسی ہے جس کے ختم ہونے کا کسی صورت میں احتمال نہیں اور یہ غذا کا ایسا ذخیرہ ہے کہ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک نظام عالم قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ مستقبل میں بہت ممکن ہے بلکہ یقین ہے کہ انسان ان حیوانات کے گوشت کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھے جن کے کھانے میں اسے آج تکلف ہو رہا ہے۔

۶۔ اب غذا کی چھٹی اور آخری قسم ملاحظہ ہو۔ اس قسم میں آبی حیوانات اور مچھلی وغیرہ داخل ہیں۔ یہی ایک ایسی غذا ہے جس کے ختم ہونے کا کبھی بھی امکان نہیں۔ دریا کی مساحت (پیمائش) زمین سے چار گنا زیادہ ہے۔ اس کے خزانے بے شمار ہیں۔ انسانی غذا کی صلاحیت رکھنے والے جانوروں کا تخمینہ کرنا، محض ظنی اور اندازہ سے بھی ممکن نہیں ہے۔ بحری حیوانات کثیر التناسل ہوتے ہیں اور ان میں غذائیت بھی بہت کافی مقدار میں پائی جاتی ہے۔ امریکہ میں مچھلیوں کا

استعمال عام طور پر رائج ہے مگر یورپین ساحلی باشندے مچھلی کو غذا کے طور پر بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ غالباً جاپانی ہی ایسی قوم ہے جسے مچھلی بہت زیادہ مرغوب ہے۔ لیکن اب تو اکثر متمدن ممالک میں باختلاف انواع، مچھلیوں کی خاص طور پر تربیت کی جاتی ہے۔

اُردو رسم خط میں ایک تبدیلی کا مشورہ

کسی زبان کی بقا و ترقی کے لئے دو باتوں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ آسان ومفید ٹائپ

۲۔ پڑھنے میں سہولت

لیکن بدقسمتی سے اُردو ابھی تک ان دونوں باتوں سے محروم رہی ہے ٹائپ کی غیر موجودگی سے اُردو کو جو کچھ نقصان پہنچتا رہا ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ کاتب سے لکھوانے۔ پتھر پر اتارنے اور پھر چھاپنے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان سے بھی کوئی بے خبر نہیں۔ کبھی حرف اڑ جاتے ہیں۔ کبھی پتھر ٹوٹ جاتا ہے اور کبھی کاتب بیمار پڑ جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں اسی خامی کی وجہ سے اخراجات کی زیادتی کے باوجود اُردو اخبارات و رسائل کو وہ آسانیاں حاصل نہیں جو انگریزی اخبارات و رسائل کو حاصل ہیں۔ اس لئے ایک حد تک اُردو اخبارات کا حلقہ اشاعت انگریزی اخبارات کے مقابلہ میں محدود ہونے کا سبب بھی اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے اور اسی سبب سے اُردو اخبارات کے مقابلہ میں ہندی و انگریزی اخبارات کو یہ فوقیت بھی حاصل ہو گئی ہے کہ اُردو اخبارات ہندی و انگریزی اخبارات کی طرح تصاویر نہیں چھاپ سکتے کچھ عرصہ سے چند اخبارات نے ابتدائی و آخری صفحوں میں تصاویر دینا شروع کر دی ہیں۔ لیکن اس میں ان کا کافی صرفہ ہو جاتا ہے۔

اب میں ان چند ہی نقصانات کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہوئے ان باتوں کی تشریح کرتا ہوں جنہوں نے ابھی تک اُردو کو مفید و آسان ٹائپ کے وجود سے محروم رکھا اور اس کے ساتھ ہی اپنی تجویز بھی پیش کرتا ہوں جس کو عملی جامہ پہنانے سے نہ صرف اِن نقصانات کی تلافی ہو جائے گی اور انگریزی سے بہتر اُردو ٹائپ بن جائے گا بلکہ اُردو پڑھنا اس قدر آسان ہو جائے گا کہ اس کے سیکھنے میں چند دن سے زیادہ صرف نہ ہوں گے۔ یا بالفاظ دیگر جس قدر جلد کوئی شخص حروف تہجی اچھی طرح پہچاننے لگے گا۔ اسی قدر جلد وہ

اُردو پڑھنا بھی سیکھ جائے گا۔

ٹائپ کے لئے حرفوں کا علیحدہ علیحدہ ہونا نہایت ضروری ہے یا اگر ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی ہوں تو اس طرح کہ ان کی حقیقی شکل میں کسی قسم کا فرق واقع نہ ہو۔ لیکن اُردو کے موجودہ رسم الخط میں اس کے بالکل برخلاف ایک حرف دوسرے حرف سے اس طرح چھوٹے چھوٹے شوشوں اور قوسوں کے ذریعہ ملا ہوتا ہے کہ ایک خاص حصہ یا نشانی کے علاوہ اس حرف کی حقیقی شکل قطعاً باقی نہیں رہتی۔ یہی نہیں بلکہ مقام استعمال و موقع کے اعتبار سے یہ حصہ یا نشانی بھی بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً "عرب" اور "ربع" میں ایک ہی حرف استعمال ہوتے ہیں لیکن دونوں جگہ حروف کی شکل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے اب اگر اُردو نستعلیق ٹائپ بنایا جائے تو ان دو لفظوں کے لئے تین کے بجائے چھ حرف رکھنا پڑیں گے لیکن اگر ان ہی لفظوں کو متصل حروف کے بجائے علیحدہ علیحدہ حروف کے ذریعہ لکھا جائے تو صرف تین ہی حروف درکار ہوں گے۔ مثلاً "عرب" کو "ع ر ب" اور "ربع" کو "ر ب ع" لکھا جائے تو جائے استعمال بدلنے کے باوجود حروف کی شکل میں اختلاف نہیں ہوتا۔

حروف کی اشکال کی تبدیلی سے زیادہ ان کے ملانے والے شوشوں و قوسوں کی کثرت اُردو ٹائپ کی راہ میں حائل ہے۔ ایک ہی حرف کو مختلف حروف سے ملانے کے لئے مختلف شوشے استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ مثلاً جب "ب" یا اسی قسم کے دوسرے حروف "ن۔ت۔ر۔وغیرہ" کو "خ۔د۔ر۔ط۔ی وغیرہ" سے ملاتے ہیں تو ہر حرف کے لئے ایک مخصوص شوشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

الفاظ:۔ بخت - بد - بر - بط - بی

کو غور سے دیکھئے۔ ہر شوشہ دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اس اعتبار سے اُردو نستعلیق ٹائپ میں صرف ایک حرف کے لئے پانچ شوشے رکھنا پڑیں گے جو بجائے خود مکمل حروف کے برابر ہوں گے۔ لیکن اب ان ہی الفاظ کو علیحدہ علیحدہ حروف کے ذریعہ

ب خ ت   ب د   ب ر   ب ط   ب ی

کی طرح لکھا جائے تو صرف ایک ہی حرف سے کام نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد الفاظ

شاہ ۔ نامہ ۔ شہر ۔ ہار[1]

کو لیجئے ویکھئے ہائے ہوز موقع ومحل کے لحاظ سے چار مختلف طریقوں سے لکھی گئی ہے اور ہر جگہ اس کی شکل جدا جدا ہے۔ لیکن اگر ان ہی الفاظ کو

ش ا ہ ن ا م ہ ش ہ ر ہ ا ر

کی طرح لکھئے تو تین حروف کی بچت ہو جاتی ہے۔ غرضکہ اس طرح اشکال حروف کی تبدیلی اور شوشوں کی کثرت نے اردو ٹائپ کی راہ میں سینکڑوں مشکلیں حائل کر دی ہیں اور یہی وجہ تھی کہ برسوں کی کوششوں ودماغ سوزیوں کے باوجود بھی کوئی صاحب ایک عرصہ تک اردو نستعلیق ٹائپ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اگرچہ عبدالکریم صاحب حسینی کی کوششیں ایک حد تک بارآور ہوئیں اور اردو نستعلیق ٹائپ بن گیا جس کے لئے صاحب موصوف قابل تحسین ومبارکباد ہیں لیکن شوشوں اور اشکال حروف کی کثرت نے اس ٹائپ کی کامیابی میں بھی وہی موانع پیدا کر دئے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

آج کل اردو اخبارات اور خاص کر روزناموں کو ٹائپ کی شدید ضرورت ہے کتابت وطباعت میں جو ایک ہی عمل کا اعادہ کرنا پڑتا ہے اس میں بہت سا وقت ضایع ہو جاتا ہے حسینی صاحب کے ٹائپ میں اعادۂ عمل کے بجائے مخصوص شوشوں اور مستعمل حروف کی مقامی شکلوں کی تلاش میں کم وبیش وہی وقت پیش آتی ہے اور کافی وقت صرف ہو جاتا ہے۔ جس کے باعث عجلت کے مضامین اور روزانہ اخبارات کی طباعت واشاعت میں وہ آسانی کسی طرح بھی پیدا نہیں کی جا سکتی جو انگریزی اخبارات کو حاصل ہے۔ لیکن اگر ہر لفظ کے حروف کو علیحدہ علیحدہ بغیر ملائے ہوئے لکھا جائے تو پھر انگریزی ٹائپ سے بھی زیادہ آسانی پیدا ہو جائے گی۔ کیونکہ انگریزی کے چھوٹے بڑے حروف (capital and small letters) کی کل تعداد اردو کے حروف تہجی سے تقریباً ڈیڑھ گنی زیادہ ہے۔

---

[1] اگرچہ ہائے مخلوط (ھ) بھی ہائے ہوز ہے۔ لیکن اس کے مخلوط التلفظ ہونے کی صفت کے باعث اس کو ایک علیحدہ حرف قرار دیتے ہوئے یہاں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

اب میں ٹائپ کو چھوڑ کر اپنے مضمون کے دوسرے حصہ پر بحث کرتا ہوں جو اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

اُردو نہ تو حکمراں قوم کی زبان ہے اور نہ اس کو اب سے پچاس سال قبل کی طرح پورے ملک کی حمایت و سرپرستی حاصل ہے۔ بلکہ اب اس کو انگریزی و ہندی کا مقابلہ کرنا ہے۔ جن میں سے ایک تو حکومت کی سرپرستی میں جڑیں پکڑ رہی ہے اور دوسری اکثریت کی حمایت سے پروان چڑھ رہی ہے ایسی صورت میں صرف ایک ہی شے ہے جو لوگوں کو اس کی طرف رغبت دلا سکتی یا اس کے حاصل کرنے کے لئے آمادہ کرسکتی ہے اور وہ "پڑھنے میں سہولت" ہے۔

اگر ایک شخص کو معلوم ہے کہ وہ دو دن میں اُردو پڑھنا سیکھ جائے گا تو یقین کیجئے ہندو ہونے کے باوجود اور "ہندی اُردو قضیہ" کی پیدا کردہ متعصبانہ فضا کے رخنہ انداز ہوتے ہوئے بھی وہ اُردو سیکھنے پر آمادہ ہوجائے گا۔ لیکن اس کے برخلاف اگر اُردو پڑھنے میں دقت ہوتی ہے اور اس کے حصول کے لئے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے تو ایک مسلمان بھی کچھ عرصہ تک کوشش کرنے کے بعد اکتا کر چھوڑ دے گا۔ یہ یاد رکھئے ایک شخص قومیت کے نام پر اپنے وقت کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوسکتا ہے لیکن اپنی آسان طلب فطرت پر غالب نہیں آسکتا۔

اگرچہ اُردو میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جو اس کو ہندی و انگریزی سے بالاتر ثابت کرتی ہیں اور جن کا اعتراف منشی پریم چند نے بھی کیا ہے تاہم ابھی اس میں وہ آسانیاں موجود نہیں جو انگریزی کی بڑھتی ہوئی ترقی کے مقابل اُردو کا پرچم لہرا سکیں یا ہندی سیلاب کو روک سکیں جو اکثریت و متمول طبقہ کی زیر حمایت برابر آگے بڑھ رہا ہے ایسی صورت میں یہ ہمارا فرض ہونا چاہئے کہ اُردو میں جو خامیاں ہیں ان کو دور کرکے اس کی اصلاح کریں اور اسے اس قدر آسان بنادیں کہ حکومت و اکثریت دونوں کو ہمارے سامنے جھکنا پڑے۔ ورنہ بصورت موجودہ اس کی کامیابی کسی طرح بھی یقینی نہیں کہی جاسکتی۔

اُردو کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تو یہ ہے کہ اس کے پڑھنے میں بہت دقت ہوتی ہے اور یہ دقت تمامتر حروف کے اتصال کے باعث ہے۔ حرفوں کی حقیقی اشکال سے تو طالب علم ابتدا ہی میں واقف ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑتا لیکن حرفوں کے اتصال

سے جو مقامی شکلیں پیدا ہوتی ہیں ان کا سمجھنا ایک مبتدی کے لئے نہایت دقت طلب امر ہے کیونکہ ان سے وہ اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ بار بار اس کی نظر سے گذر کر ذہن میں نقش نہ ہو جائیں اور اس کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے اور ایک شخص زیادہ عرصہ تک اپنے ارادہ پر اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جبکہ جو کچھ وہ پڑھتا جائے وہ اس کے سمجھ میں آتا جائے۔ کیونکہ اس طرح اس کو اپنی کامیابی پر انتہائی مسرت ہوتی ہے جو اس کی دلچسپی کو بڑھا دیتی اور آگے پڑھنے کے لئے آمادہ کرتی ہے لیکن اردو میں اس کے برعکس طالب علم اس دوران میں حرفوں کی تبدیلیوں اور حروف کی مقامی اشکال کی یکسانیت کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر گھبرا جاتا ہے۔

ایک طالب علم کو حروف تہجی یاد کرنے کے دوران میں معلوم ہوتا ہے کہ ہائے ہوز کی شکل "ہ" کی طرح ہے لیکن جب وہ لفظ "ہار" پڑھتا ہے تو اس کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا پہلا حرف ہائے ہوز ہے جو پہلی شکل سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے بعد جب وہ لفظ "شہر" پر پہنچتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کا دوسرا حرف ہائے ہوز ہے۔ جو پہلی دوسری دونوں شکلوں سے مختلف ہے۔ پھر لفظ "نامہ" تک یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کا آخری حرف ہائے ہوز ہے جو پہلی، دوسری اور تیسری تینوں شکلوں سے مختلف ہے۔ اب بتائیے ایک مبتدی جو آسانی کا متلاشی ہوتا ہے کیا گھبرا نہ جائیگا کیا وہ ان سب کو یاد رکھ سکے گا۔ کیا یہ خیال اس کو یہ دل نہ کرے گا کہ شاید ہائے ہوز ابھی اور باقی ہوں یا جس طرح ہائے ہوز کئی ہیں اسی طرح دوسرے حروف بھی کئی کئی ہوں گے۔

لفظ "معمر" کو لیجئے۔ اس میں "ع" اور "ر" کی شکلیں ان شکلوں سے بالکل مختلف ہیں جن کو ایک طالب علم شروع شروع میں پڑھتا ہے اس طرح لفظ "مآب" میں اول تو "م" کی شکل اصل شکل سے مختلف اور پھر "م" کے الف ممدودہ سے مل جانے کے باعث ایک ایسی شکل بن جاتی ہے جو طالب علم کے لئے بالکل نئی ہوتی ہے اور جس کا سمجھنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

اشکال حروف کی کثرت سے زیادہ بعض حروف کی یکسانیت طالب علم کے انتشار کا باعث ہوتی ہے۔ لفظ "ید" کو دیکھئے۔ "و" کی شکل اس کی حقیقی شکل سے ذرا بھی مشابہ نہیں۔ اس کے

برخلاف " بہ " سے ملتی جلتی ہے اس لئے شروع شروع میں طالب علم " بد " " بر " پڑھتے ہیں۔ لیکن جب ان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ " بر " نہیں " بد " ہے تو پھر وہ " بر " کو " بد " پڑھنے لگتے ہیں۔ کیونکہ بتدی کی نظر کبھی چھوٹے چھوٹے اختلافات پر نہیں پڑتی۔ برخلاف اس کے آنے والے الفاظ میں پڑھے ہوئے حروف کے ساتھ مشابہت کا متلاشی ہوتا ہے۔ مجھے خوب خیال ہے کہ جب میں ابتدائی درجہ میں پڑھتا تھا تو ایک ہندو لڑکے نے جو نیا نیا داخل ہوا تھا " کا " کو " کھا " پڑھا تھا۔ جس پر عرصہ تک بیچارہ کا مذاق اڑتا رہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم سب سے زیادہ عقلمند تھا اس نے جو کچھ سمجھا اور پڑھا وہ قاعدہ اور عقل کے عین مطابق تھا۔ " کا " کا تجزیہ کیجئے۔ آپ کو اس کا ثبوت مل جائے گا۔

لفظ " ہالہ " پر غور کیجئے۔ اس کے دوسرے حرف " ا " اور تیسرے حرف " ل " کی شکل میں ذرا بھی فرق نہیں۔ اس لئے طالب علم اس وقت تک ان دونوں میں امتیاز نہیں کر سکتا جب تک کہ تشریح کر کے بتایا نہ جائے کہ ایسی یکساں اشکال میں " ا " کے بعد کوئی حرف ملا ہوا نہیں آتا اور " ل " میں اس کے برعکس ہوتا ہے لیکن اس قسم کی تشریحات کی جگہ جگہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ان کو یاد رکھنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے اور یہ بجائے تسلی کے طالب علم کے ذہنی انتشار کا باعث بن جاتی ہیں،

ایک اور مشکل یہ ہے کہ شوشے اور نقطے چھوٹے چھوٹے اور قریب قریب ہوتے ہیں اس لئے بتدیوں کو یہ تمیز کرنے میں انتہائی دقت ہوتی ہے کہ کون نقطہ کس شوشہ سے متعلق ہے اور بعض اوقات تو بڑی سخت غلطی کر جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چوتھے درجہ میں پڑھتا تھا تو ایک جگہ لفظ " انجم " کتاب میں آیا۔ میں نے اس کو " اب خ م " پڑھا تھا۔ جس پر ماسٹر صاحب بے انتہا ناراض ہوئے۔

شوشوں کے قرب کے علاوہ ایک خامی یہ ہے کہ اگر کسی لفظ میں (ی یا یے) دو حرفوں کے درمیان ملی ہوئی آتی ہے تو کوئی یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ آیا وہ یائے مجہول ہے یا یائے معروف اس لئے جن طلباء کو ایسے الفاظ کا تلفظ معلوم نہیں ہوتا وہ یائے مجہول کی جگہ یائے معروف اور یائے معروف کی جگہ یائے مجہول پڑھ جاتے ہیں۔ لفظ " بیڑی " کو دیکھئے۔ آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ شوشوں اور یائے مجہول و معروف میں امتیاز نہ ہونے کے باعث کس قدر غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ بظاہر شکل کے

اعتبار سے تو یہ صرف ایک ہی لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً تین لفظ ہیں جن کا تلفظ اور حروف دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں پہلے لفظ کے معنی تو اس شے کے ہیں جسے عوام سگرٹ کی جگہ پر استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے کے مجرموں کی زنجیر اور تیسرے کے آلۂ برقی۔ اس لفظ کو مختلف اشخاص سے پڑھنے کو کہیئے۔ کوئی پہلے معنی کے لحاظ سے پڑھے گا۔ کوئی دوسرے اور کوئی تیسرے لیکن اگر

ب ی ڑ ی   ب ے ڑ ی   ب ے ٹ ر ی

کی طرح علیحدہ علیحدہ حروف کے ذریعہ لکھئے تو کسی قسم کی غلطی کا احتمال باقی نہیں رہتا اور چند دن کا مبتدی بھی ہر لفظ کو تھوڑی سی کوشش کے بعد بآسانی صحیح صحیح پڑھ سکتا ہے۔

اس پر بعض صاحبان یہ فرمائیں گے کہ ان ہر سہ الفاظ کو ان کے موقع و محل کے اعتبار سے صحیح پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے جواب کے لئے صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ نقص ہر حالت میں باقی رہتا ہے اور کیا یہ ممکن نہیں کہ بعض جگہ تین یا دو مطالب پیدا ہوتے ہیں۔

آپ نے اکثر تجربہ کیا ہوگا کہ جن طلبا نے اردو شروع کی ہو اگر ان کو "دل آزاری" کی طرح ایسے الفاظ دیدئے جائیں جن میں حرف علیحدہ علیحدہ ہوں تو وہ آناً فاناً پڑھ دیتے ہیں۔ مگر چونکہ الفاظ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے بعض اوقات ایک لفظ کے حرف کو دوسرے لفظ کے حرف سے ملا دیتے ہیں۔ لیکن اگر ایسی عبارت لکھی جائے جس میں حروف کے ساتھ الفاظ بھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں تو یہ غلطی بھی باقی نہیں رہتی اور پڑھنے میں انتہائی سہولت پیدا ہو جاتی ہے ذیل میں اس عبارت کا ایک نمونہ دیا جاتا ہے۔

تم[۱] ک و   ج س   ع ل م   ک ی   ض ر و ر ت   ہ ے   و ہ   و ہ
ع ل م   ہ ے   ج و   ت م ھ ا ر ی   س ا ک ن   و   پ ژ م ر د ہ
ق و و ت[۲] و ں   ک و   م ت ح ر ک   ا و ر   ش گ ف ت ہ   ک ر د ے۔

---

[۱] تم کو جس علم کی ضرورت ہے وہ وہ علم ہے جو تمھاری ساکن و پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ کر دے۔

[۲] یہاں تشدید کے بجائے ایک حرف کو مکرر لکھا گیا ہے۔ اس طرح تشدید کی ضرورت نہیں رہتی۔

آپ کو اس عبارت کے پڑھنے میں الجھن ضرور محسوس ہوگی اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ اس قسم کی عبارت پڑھنے کے عادی نہیں اور برسوں سے متصل حروف سے لکھی ہوئی عبارت پڑھتے آرہے ہیں لیکن جب اس کے عادی ہو جائیں گے تو موجودہ رسم خط کی عبارت سے زیادہ جلد اور آسانی کے ساتھ پڑھ سکیں گے اس عبارت کو ایک چند دن کے طالب علم کو دیجئے جو صرف حروف کی شکلوں کو پہچانتا اور زیر و زبر و پیش کے استعمال سے واقف ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ بغیر آپ کی رہنمائی کے تھوڑی سی کوشش کے بعد آسانی سے پڑھ لیتا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر یہ رسم خط جاری ہو جائے تو اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں کم از کم ۵۰ فی صدی کا اضافہ ہو جائے گا اور جو اخبارات و رسائل اس رسم خط میں شائع ہوں گے نہ صرف ان کے اخراجات میں کمی اور طباعت و اشاعت میں آسانی پیدا ہو جائے گی بلکہ ان کا حلقہ اشاعت بھی موجودہ رسم خط کے اخبارات سے وسیع ہوگا۔

بعض اصحاب یہ اعتراض کریں گے کہ تجویز کردہ رسم خط موجودہ رسم خط کے مقابلہ میں زیادہ جگہ گھیرے گا۔ جواباً عرض ہے کہ موجودہ رسم خط میں حروف کی مقامی شکلیں اس قدر چھوٹی ہوتی ہیں کہ کاتب اس سے زیادہ باریک عبارت نہیں لکھ سکتے جتنی آج کل کے اخبارات میں لکھی جاتی ہے اور اگر لکھ بھی سکیں تو پڑھنے میں انتہائی دقت ہوگی۔ لیکن نئے رسم خط کی عبارت ٹائپ کی مدد سے کاتب سے کہیں زیادہ باریک لکھی جاسکے گی اور چونکہ حروف مکمل اور علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ اس لئے پڑھنے میں بھی کسی قسم کی دقت نہ ہوگی اور ایک حد تک اس نقصان کی تلافی ہو جائے گی لیکن اگر اس کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس رسم خط کے فوائد اس قدر زیادہ ہیں جن کے سامنے تھوڑے سے کاغذ کے نقصان کی کچھ حقیقت نہیں۔

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ ان کلمات کے لکھنے کی کیا صورت ہوگی جن میں حروف شمسی اور قمری استعمال ہوئے ہوں۔ میری رائے میں اس کی بہتر اور آسان صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حروف قمری میں سے "ا" اور حروف شمسی میں سے "ال" کو نکال دیا جائے۔ لیکن اگر آپ اس

اخراج کے لئے تیار نہیں تو حروف شمسی و قمری کے کلمات " نورالشمس " اور " نورالقمر " کو بالترتیب " ن ور ال[1] ش ش م س " اور " ن ور ال ق م ر " لکھا جا سکتا ہے لیکن اس صورت میں وہ آسانی ممکن نہیں جو اخراج کی صورت میں پیدا ہو جاتی۔

اب صرف ایک بات باقی رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر یہ رسم خط جاری ہو جائے تو عام خط و کتابت کے لئے کونسا رسم خط ہوگا۔ چونکہ اختصار نویسی میں اُردو کے موجودہ رسم خط کو باقی رکھنا ضروری ہے لیکن اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو وقت پڑھنے میں ہوتی تھی وہ اب لکھنے میں ہوا کرے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ لوگ جو بصورت دیگر جاہل مطلق رہجاتے یا وہ جو اُردو کی طرف توجہ بھی نہ کرتے کم از کم اُردو پڑھنا تو سیکھ جائیں گے۔ جس سے اُردو کی ترقی اشاعت میں بہت مدد ملے گی۔ علاوہ ازیں کچھ نہ کچھ عرصہ تک اردو پڑھنے کے بعد ان لوگوں کو بھی یہ خیال ضرور ہوگا کہ لکھنا سیکھ کر اس کی تکمیل کر لی جائے جو اُردو زبان کا سب سے اہم حصہ ہے اور جس کے باعث اُردو کو دیگر زبانوں پر برتری و فوقیت حاصل ہے۔ اور اگر اس کثیر تعداد میں سے کچھ لوگ نہ بھی سیکھیں گے تو وہ اس نئے رسم خط کے ذریعہ اپنا کام نکال سکیں گے۔

---

[1] غیر ملفوظ یا خاموش (Silent) حروف کے نیچے نشان (ـ) لگا دیا ہے۔ اس سے طالب علم کو پڑھنے اور سمجھنے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔

ادب اور سماج

(اپریل ۱۹۳۵ء میں اندور میں جو آل انڈیا ہندی ادبی کانفرنس ہوئی تھی اس میں بعض حوصلہ مند ادیبوں نے یہ طے کیا تھا کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ایک ادبی وفاق قائم کیا جائے اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلی تجویز یہ تھی کہ ایک ہندی رسالہ نکالا جائے جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں جو ادب شایع ہو رہا ہے اسے پیش کیا جاسکے اس خیال کے حامیوں میں منشی پریم چند بھی تھے۔ اس لئے ان کے رسالہ "ہنس" کو ہی اس کام کے لئے منتخب کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء سے "ہنس" برابر ہر مہینہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ادب ہندی زبان میں پیش کر رہا ہے۔ ذیل میں اسی رسالہ کے ایک مضمون کو ہم درج کر رہے ہیں۔ ہم اس مضمون کو جس طرح یہ "ہنس" میں شایع ہوا ہے بجنسہ ویسے ہی اردو رسم الخط میں نقل کر رہے ہیں اس سے اردو داں طبقہ کو اندازہ ہوسکے گا کہ "ہنس" میں کس قسم کی زبان کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مضمون کا ہندی کے سلیس اور فصیح مضمونوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس کی زبان غیر معمولی طور پر صاف اور سنسکرت کی گرانباری سے پاک ہے دوسرے مضمونین کی زبان اس سے کہیں زیادہ کٹھن ہوتی ہے۔ اس کے شایع کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمارے اہل ذوق قارئین اور خصوصاً ہمارے زبان کے ادیب اور مبصر ہندی ادب کی رفتار ترقی سے واقف ہوسکیں اور اپنی زبان کو وسیع اور ہمہ گیر بنانے کے لئے ضروری اصلاحی تدبیروں کو اختیار کرسکیں)۔

ایک سمے تھا جب ساہتیہ (ادب) کا سماج کے ساتھ کوئی وشیش سمبندھ نہیں تھا۔ پرنتو اس یگ میں ایسا نہیں ہے۔ آج کل ساہتیہ سماج سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ زمانہ گیا جب "چندر کانتا" اور "حاتم طائی" کی دھوم تھی۔ دور کیوں جائیے۔ ایک ہمارے بہتر ہیں جواب بھی کبھی کبھی "طوطا مینا"

کی کہانی پڑھا کرتے ہیں ۔ یدی ان سے کوئی پوچھے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو یہی کہیں گے "طبیعت نہیں مانتی" "لیلےٰ مجنوں" "شیریں فرہاد" "گل بکاولی" کی کہانیاں کیا ہم اور آپ چاؤ سے فلم میں نہیں دیکھتے ہیں۔ والیس (Wallace) اور گاروس (Garvis) کا یگ سماپت نہیں ہوا ہے ۔ انگلینڈ کے Penny Dread- اور Shilling Shockers اب تک مشہور ہیں ۔ مگر جو کچھ ہو ہم یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ سنسار کی رُچی ایسی ہے۔ جو ساہتیہ کے سچے اور گہرے پریمی ہیں وے ساہتیہ کو دوسری کسوٹی پر رکھتے ہیں۔ ان کا دھیئے دوسرا ہوتا ہے۔ وے تکیوں کے نیچے رکھی ہوئی کہانی کی پُستکوں پر لٹو نہیں ہوتے ۔ وے نینی تال کی جھیل کے کنارے بیٹھے ہوئے مچھلی بازوں میں سے نہیں ہیں جو مچھلی بھی مارتے ہیں اور کہانیاں بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ وے دھیرے اور ایکاگرتا کے ساتھ ساہتیہ کا ادھیئن کرتے ہیں اور وے ہی ہم کو اور آپ کو بتائیں گے کہ سماج اور ساہتیہ کا کیا سمبندھ ہے۔

جوں جوں سماج نے اُنتی کی اس کا پربھاؤ ساہتیہ پر پڑھتا گیا ۔ ایک زمانہ وہ تھا جب ہندی ساہتیہ میں "چندرکانتا" ہی مشہور تھی ۔ آج وہ سمے ہے جب لوگوں کو "سیوا سدن" پسند آتا ہے۔ کتنا پریورتن ہو گیا ! اس کا کارن یہی ہے کہ رُچی کے انوسار ساہتیہ کا بھی رنگ بدل گیا۔ لوگوں نے اپنا نیا ساہتیہ بنایا ۔ ساہتیہ میں مہتو آ ہی نہیں سکتا جب تک وہ سماج سے دور رہے گا۔ چودھویں شتابدی کے فرینچ لیکھک بکیچیو (Boccaccio) کو لیجئے ۔ اس کی کہانیاں سنسار بھر میں مشہور ہیں۔ کئی ایک بھاشاؤں میں وہ چھپیں ۔ انگلینڈ کا سب سے پہلا کوی چوسر (Chaucer) بھی اسی سمے میں ہوا۔ اس کی کینٹربری ٹیلس (Canterbury Tales) کو لیجئے ، زمین اور آسمان کا انتر ہے۔ بکیچیو نے من کو لبھانے والی کہانیاں لکھیں اور کداچت سنسار میں ایسے بہت کم ہیں جو اس کے سمان لکھ سکیں ۔ پرنتو وہ پھر بھی سماج سے دور تھا۔ چوسر کی کہانیوں میں سماج کا پرتی بنب دکھائی دیتا ہے ۔ اس نے اپنی کہانیوں میں سماج کے کھیہ انگوں کی کڑی آلوچنا کی ۔ اس نے مانو ہر دیہ کے ساتھ ساتھ مانو سماج کا بھی ادھیئن کیا تھا ۔ اس نے سماج کو اپنی آنکھوں س

دیکھا تھا۔ یہی کارن ہے کہ اس کا چہ ترچیترن بڑا ہی سچا ہے۔ اور اسی کارن اس کی گوتا میں مہتو ہے۔

جب جب ساہتیہ سماج سے الگ ہوا ہے اس میں وہ جان نہیں رہی ہے۔ وہ سُندر ہو پرنتو اس میں جیون اُتپادک شکتی نہیں رہتی۔ ساہتیہ تو ایک پرکار کا درپن ہے جس میں سماج کی مورتی صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ یدی لیکھک یا کوی اپنے کو سماج کا انگ سمجھتا ہے تو اس کی کرتیوں میں سماج اوشیہ جھلکے گا۔ اور یدی وہ اپنے کو اپنے یُگ سے الگ رکھے گا تو اس کی کتابوں میں ایک عجیب طرح کا سواد ہوگا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ وہ کلا کار ہے اور اس کے ہردیہ کو پرتی دن کے پرشنوں سے کوئی سمبندھ نہیں۔ پرنتو اس کا ارتھ یہ نہیں ہے کہ وہ گرجے کے پادری کے سمان کھڑا ہو کر سنسار کو کھری کھری سنائے۔ ساہتیہ یعنی سچا ساہتیہ وہی ہے جس میں زبردستی کی شکشا نہ دی جائے۔ کسی کے گلے میں کڑوی دوا ٹھونسنے سے کیا لابھ؟ کیا اور کوئی طریقہ نہیں ہے کہ ساہتیہ مانو جیون پر پربھاؤ ڈالے؟ یہی ایک ایسی بات ہوتی ہے جس سے بہت لوگوں کو ٹھوکر پہنچتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لیکھک یا کوی ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا ہے اور کہتا ہے "یہ دیکھو یہ بُرا ہے وہ بُرا ہے۔ سنسار میں یہ اوگن ہیں اور ان کو ٹھیک کرو۔ میں یہاں سے سب دیکھ رہا ہوں"۔ تو ہم جھلا پڑتے ہیں۔ ایسے لیکھک یا کوی اور ایک نٹ میں کیا انتر؟ نٹ بھی تو رسّی اور بانس پر اُلٹا لٹک کر ہماری اور پرسنتا سے تاکتا ہے۔

ساہتیہ میں شکشا ہونا تو اُچت ہے۔ پرنتو ہاں، پروکش روپ سے، پرتیکش روپ سے نہیں۔ یدی ساہتیہ جیون کا درشن ہے تو اسی درشن میں جیون کے لئے بل اور شکتی ملیں گے سنسار کے جتنے بڑے کلا کار ہوئے ہیں، انھوں نے پہلے اپنا دھرم یہی سمجھا کہ وے جیون کے رہسیہ کو ڈھونڈھیں اور پرکھیں اور تب لوگوں پر چھوڑ دیں کہ دے اس پرکھ میں اپنے لئے ادھار اور شکتی ڈھونڈھیں۔ ہماری اپنی ہندی میں ابھی اس بات کی کمی ہے۔ اُردو میں جیسے "لیلےٰ مجنوں" اور "گل و بلبل" کے بھوت اب تک شاعروں کو تنگ کرتے ہیں اُسی پرکار ہندی کے کویوں پر بھی کئی بھوت سوار ہیں۔ "لکیر کے فقیر" ہی ان کے لئے ٹھیک ہے۔ یدی ان سے کوئی پوچھے کہ کیوں صاحب کیا

آپ دوسرے ڈھنگ پر نہیں آسکتے ؟ تو ناک سکوڑ کر یہی کہیں گے " دوسرا تو کوئی ڈھنگ ہی نہیں ہے" بیچارے اندھے سورداس اور گوسوامی تلسی داس کی تو مرن ہے ۔ جس نے چاہا اس نے روئی کے سمان انھیں دھن ڈالا اور کہیں اتفاق سے ایسے مہاشے آدھونک ٹیگ کی طرف جھک جاتے ہیں تو دیکھیئے کیا کرتے ہیں ؟ بس پھر پرشنشا ہی دینے لگتے ہیں ۔ کہانی لیکھکوں میں ہمارے یہاں بہت کم ایسے ہیں جنھیں ہم اونچا استھان دے سکتے ہیں ۔ پریم چند جی کا نام کوئی نہیں بھول سکتا ۔ وے بھی پرشنشا دیتے ہیں ۔ پرنتو کم سے کم اوروں کے سمان یہ تو نہیں کہتے کہ دنیا میں دودھ ہی کی دوکانیں ہیں شراب کہیں بکتی ہی نہیں ، ایسے ہی مہانو بھاؤ ہمارے ساہتیہ کو اونچے استھان پر بٹھا سکتے ہیں ۔

ساہتیہ کو جیون سے الگ کرنا ایسا ہی ہے جیسے بیوی کو میاں سے ۔ یہ سچ ہے کہ آج کل طلاق کا زمانہ ہے ۔ پرنتو خیر ہمارے یہاں اتنا زور نہیں ہے ۔ ساہتیہ پر جیون کی چھاپ سدا رہتی ہے آج کل کے روسی ناٹکوں کو دیکھیئے ۔ ان میں روس کی ورتمان ستھتی کا کتنا سچا درشن ہے ایسے بہت سے ناٹک ہیں جن میں ہمیں آج کل کی روسی سبھیتا اور وچار دھارا کا پربھاؤ دکھائی دیتا ہے ۔

"Inga" by (ٹیمپو) "Tempo" by Nikolai Pogodin.

"Bread" by Viladimar (انگا) Anatole Clebou.

"Fear" by Alexandar Afinogenyev. (بریڈ) Kirshon.

(فیئر) وغیرہ ناٹک آدھونک روس کی بھنّ بھنّ تصویریں ہیں ۔ ان ناٹکوں کا پہلا دھیئے یہ نہیں ہے کہ وے لوگوں کو کمیونزم (Communism) کا پاٹھ پڑھائیں ۔ وے اپنی جنتا اور ان کی کٹھنائیوں کا سچا چتر کھینچتے ہیں ۔ انھیں چتروں میں ہمیں سچی شکشا دکھائی دیتی ہے ۔ آدھونک انگریزی ساہتیہ کو دیکھیئے ۔ وہ بھی آدھونک انگلینڈ سے الگ نہیں ہے ۔ اس میں بھی انگلینڈ کی ورتمان دشا کا چتر ہے ۔ پرنتو ہمارے یہاں دوسری حالت ہے ۔ ہم اور ہمارے وچار اتنے دقیانوسی ہیں کہ ہم دھوم دھام بھی کریں گے تو اپنے لکڑ دادا ہی کے حقے کو پئیں گے ۔ دوسرا خریدیں گے ہی نہیں ۔ یہی کارن ہے ہمارے ساہتیہ میں اب تک سچی سمالوچنا کے لئے کوئی ستھان نہیں ہے ۔ ہم اب بھی باتوں کو دوہراتے

ہیں اور ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ تلسی داس پر انگلی اٹھائے۔ نیا یہ کہ گلے پر چھری چل جائے۔ پرنتو کسی پراچین کوی یا ساہتیکش پر وچار پرکٹ کرنا انوچت ہے۔ اس پرکار کی بھگتی سے کیا لابھ؟ اور اس پرکار کے بگلہ بھگتوں سے ساہتیہ کو کوئی فایدہ نہیں۔ یہی تو کارن ہے کہ آج کل جس نے ذرا کہا "مجھے کوئی شبد انت سے بلا رہا ہے" بس ہم نے پاٹھ شالا کے لڑکوں کے سمان ٹوپیاں پھینکنا شروع کیں اور کہا "واللہ کیا بات کہی ہے؟" اس دن سے وہ رہسیا وادی کوی کہلایا جانے لگا۔ اس سے کوئی مطلب نہیں کہ اس نے کبیر کی سوکھی روٹیوں کو کتنا چاٹا ہے۔ مگر وہ ایک نیا یگ ستھاپت کرنے والا رہسیا وادی کوی کہلاتا ہے۔ یدی ہمارے یہاں سمالوچنا کا پربھاؤ ہو تو ساہتیہ میں اچکے اور رنگے سیار کبھی نہ پیدا ہوں۔ سمالوچنا کا ہونا ہی ایک پرمان ہے کہ ساہتیہ اور جیون میں گھنشٹ سمبندھ ہے۔

جب تک ہمارے ساہتیہ میں ہمارے جیون کی چھاپ نہیں ہوگی ہمارا ساہتیہ کبھی وسترت روپ سے سپھل نہیں سکتا۔ اور جب تک ساہتیہ پرتیک یگ کا پرتی دمب نہیں ہوگا۔ جنتا اس کو اپنائے گی نہیں اور سادھارن منشیوں کو اس سے کوئی لابھ نہیں ہوگا۔ سماج کا درشن ساہتیہ اور کلا ہے۔ انگلینڈ کا مہاکوی شیکسپیئر بھی اپنے یگ کا تھا۔ پرتیک یگ اپنے کوی اور اپنے کلاکار پیدا کرتا ہے اور اسی پرکار کوی اور کلاکار بھی اپنے اپنے یگوں کا سنکار کرتے ہیں۔ سماج اور ساہتیہ دو ہردے ہیں۔ ایک کے ہردے کی دھڑکن دوسرے کو سنائی دیتی ہے۔

تنقید و تبصرہ

کتب:-

تاریخ الحدیث | مولفہ قاضی عبدالصمد صاحب سیوہاروی۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۳۰۰ صفحے۔ قیمت ۲ روپے ۔ ملنے کا پتہ مولوی محمد ادریس صاحب مکتبہ شرقیہ دہلی۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے علم حدیث کی تاریخ میں لکھی گئی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی اس عنوان پہ اُردو زبان میں کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر قاضی عبدالصمد صاحب نے اس کتاب میں حدیث کی تاریخ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ عہد بعہد کے رواۃ اور ان کی کتب، علوم حدیث اور ان کے حاملین کے طبقات اور ائمہ جرح و تعدیل کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اور کوئی گوشہ حدیث کی تاریخ کا تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ منکرین حدیث کے جوابات دینے میں حدیث کی حمایت اور عقیدت کا جذبہ ان کے اوپر غالب آگیا ہے۔ لیکن یہ مذہبی بحث ضمنی طور پر آگئی ہے۔ بحیثیت تاریخی معلومات کے یہ کتاب اُردو زبان میں قابل قدر اضافہ ہے۔

علوم الحدیث | مولفہ مولانا شاہ محمد عزالدین میاں صاحب پھلواروی خطیب شاہی مسجد لاہور۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ معمولی۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۱۶۸ صفحے۔ قیمت ۱۲؍ ۔ مصنف سے مل سکتی ہے۔

یہ کتاب بھی حدیث کی تاریخ میں ہے۔ اس میں بھی عہد بعہد کی حدیث کی کتابوں، علوم حدیث اور محدثین کے طبقات کے حالات لکھے گئے ہیں۔ لیکن اختصار کے ساتھ۔ حجیت حدیث کی بحث بھی چھیڑی گئی ہے جو خالص مذہبی ہے اور جس کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور غالباً یہی جذبہ اس کی تصنیف کا بھی محرک ہوا ہے۔ بہر صورت کتاب ابتدائی معلومات کے لئے مفید ہے۔ قیمت کسی قدر زیادہ ہے۔

ا۔ ح

مادرِ ہند | از حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۷ صفحات کتابت طباعت اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ۔ شاد بک ڈپو چوگھڑہ پٹنہ سٹی۔

یہ عجیب و غریب مثنوی حضرت شاد نے ہندوستان کے ناخوشگوار سیاسی حالات سے متاثر ہوکر لکھی ہے قصے کا خلاصہ یہ ہے۔ "کہ ایک زمانہ میں مادرِ ہند (ہندوستان) بڑے عروج پر تھی اس کے دو سپوت رام اور رحیم بڑے میل ملاپ اور پیار اور محبت سے رہتے تھے۔ مگر بعد میں کچھ ایسی ہوا چلی کہ دونوں میں بگڑ گئی' مادرِ ہند' نے بہت کچھ اونچ نیچ سجھائی مگر ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ آخر ہندوستان کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ اور غیروں کی نظریں اُس پر پڑنے لگیں۔ تاآنکہ کچھ نووارد تجارت کے بہانے سے آئے اور مادرِ ہند پر قابض ہوگئے۔ مادرِ ہند نے پھر ان ناسمجھ بچوں کو سمجھایا اور تاجروں کو ان ناسمجھ فرزندوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی سفارش کی۔ آخر ۱۸۵۸ء کے شاہی فرمان اور ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی پر یہ کہانی ختم ہوگئی"

یہ مثنوی آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے حضرت شاد نے ملکہ معظمہ کی جوبلی کے موقع پر لکھی ہے اگرچہ ضروریات و مقتضیات ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں تاہم آخری حصے کو چھوڑ کر جس میں وفاداری کا جذبہ زیادہ نمایاں ہوگیا ہے یہ مثنوی آج بھی ہمارے لئے درس عبرت ہے اگرچہ یہ بڑی حد تک افسوسناک بات ہے کہ ارباب زمانہ کی ناقدردانی کی وجہ سے اتنے طویل عرصے تک یہ کتاب منظرِ عام پر نہ آسکی لیکن اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ حضرت شاد کو کئی بار اس پر نظر ثانی کا موقع مل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں حسن و عشق کی چاشنی نہیں ہے پھر بھی کہیں بے نمکی خشکی یا تلخی نہیں پیدا ہوئی ہے۔

الزہرا | از جناب عبدالرحمٰن صاحب کاشغری استاد دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۸ صفحے کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا۔ قیمت ۸؍ مصنف سے شبلی ہوسٹل لکھنؤ یا مکتبہ الضیا کے پتے پر مل سکتی ہے۔

یہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب کاشغری کے ان عربی قصیدوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ندوے میں

مختلف موقعوں پر پڑھے ہیں کاشغری صاحب ترکی النسل ہیں عربی کی تعلیم شروع سے آخر تک ندوے میں پائی ہے۔ جو شخص ان کی طالب علمی کی زندگی سے واقف ہے اُسے معلوم ہے کہ انھوں نے عربی زبان وادب کے حصول میں کس قدر محنت شاقہ برداشت کی ہے۔ شاعری کا انھیں ابتدا سے ذوق تھا اب اس ذوق میں پختگی آچلی ہے اور یہ بات ان کے زیر نظر دیوان سے ظاہر ہے۔ کلام بے عیب ہے اور جملہ لوازم شاعری سے مرصع ہے۔ البتہ بقول مقدمہ نگار صاحب ایک عجمی کے کلام کو عربی شعرا شوقی بک رافعی۔ احمد محرم وغیرہ کی شاعری کے معیار پر پرکھنا انصاف سے بعید ہوگا۔ بایں ہمہ بعض بعض شعروں پر طبیعت وجد کرنے لگتی ہے اور اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی عربی شاعر بھی یہ شعر اسی طرح کہتا۔ شروع میں مولوی مسعود عالم صاحب ندوی ایڈیٹر الضیا (عربی) کا طویل مقدمہ بھی ہے جو بہت محنت اور خلوص سے لکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ عربی داں طبقے میں اس دیوان کی کافی قدر و منزلت کی جائے گی۔

یادِ حالی | مرتبہ غلام طیب صاحب لکچرر اُردو اورنگ آباد کالج سائز چھوٹا ضخامت ۱۴۲ صفحے کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا۔ قیمت درج نہیں غالباً پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پتے سے مل سکتی ہے۔

عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں بزم حالی کے ماتحت ۵ نومبر ۱۹۳۷ء کو مولانا حالی کی صد سالہ برسی کا جشن بہت اہتمام سے منایا گیا تھا۔ اس موقع پر مولانا پر بہت اچھے اچھے مضمون پڑھے گئے تھے اور اُن کی مختلف حیثیتوں کو نمایاں کیا گیا تھا۔ یہی مضمون اب یادِ حالی کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کر دئے گئے ہیں۔ مضمون لکھنے والوں میں مولٰنا عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو۔ سر شیخ عبدالقادر۔ مولوی سید محی الدین صاحب پرنسپل کالج۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف۔ ڈاکٹر محی الدین صاحب اور شیخ چاند خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مضامین کے علاوہ خاص خاص پیام بھی ہیں جو اس موقع پر ملک کے نامور لوگوں کی طرف سے بھیجے گئے ہیں چند اچھی اچھی نظمیں بھی ہیں جو مولانا حالی پر لکھی گئی ہیں۔ غرض یہ مجموعہ ہر حیثیت سے کامیاب ہے اور خاصے کی چیز ہے لکھائی چھپائی

میں بھی نہایت نفاست اور سلیقے سے کام لیا گیا ہے شروع میں مولنٰنا حالی کی تصویر ہے ہم اس کامیابی پر بزم حالی کے کارکنوں کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

یادگار حالی | مرتبہ منشی دیا نرائن نگم بی اے۔ سائز ٹرا ضخامت ۱۰۴ صفحے۔ کتابت وطباعت اچھی کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ دفتر زمانہ پریس کان پور۔

مولنٰنا حالی کی صد سالہ برسی کی تقریب میں اُردو کے مشہور رسالہ زمانہ کان پور نے بھی نہایت اہتمام سے خاص نمبر (حالی نمبر) شائع کیا تھا۔ اسی خاص نمبر کو یادگار حالی کے نام سے اب کتابی شکل دے دی گئی ہے نگم صاحب نے اس پرچے یا کتاب کو بہت محنت سے مرتب کیا ہے۔ اور اس بات کی خاص طور پر کوشش کی ہے کہ حالی مرحوم کی علمی وعملی زندگی کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔ مضامین میں "حالی ایک انسان کی حیثیت سے"۔ "مسدس حالی"، "مولانا حالی کا فارسی کلام" "حالی اور غزل"، خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان کے علاوہ نظمیں بھی اچھی ہیں مولنٰنا حالی کے کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست بھی ہے۔ آخر میں ایڈیٹر صاحب نے بتایا ہے کہ رسالہ زمانہ سے مولنٰنا کو کس قدر تعلق اور دلچسپی تھی۔ مولانا حالی اور اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی تصویریں بھی ہیں۔

اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان | از مولانا ابو الکلام آزاد تقطیع بڑی۔ ضخامت ۷۵ صفحات کتابت وطباعت اوسط کاغذ اچھا قیمت ۸ ملنے کا پتہ۔ الہلال بک ایجنسی فاروق گنج بیرون شیرانوالہ دروازہ لاہور۔

یہ عالمانہ مضمون الہلال مرحوم کے صفحات پر شائع ہوا تھا اب الہلال بک ایجنسی نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا ہے اس میں مولانا نے اولیاء اللہ و اولیاء شیطان وحزب اللہ وحزب الشیطان۔ اصحاب النار و اصحاب الجنۃ اصحاب المیمنہ و اصحاب المشئمہ۔ اصحاب الیمین و اصحاب الشمال

کے زیر عنوان دنیا کے دو متضاد گروہوں کی تفصیل بتائی ہے، جن حضرات کو مولانا کے اس قسم مضامین کے مطالعے کی سعادت نصیب ہوئی ہے انھیں اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اس میں کیا کیا نکات بیان فرمائے ہوں گے۔ الہلال بک ایجنسی مستحق ستائش ہے کہ وہ ایسی نایاب چیزیں جو مرحوم الہلال کے فائلوں میں مدفون ہیں تفحص و تلاش کے بعد اس اہتمام سے شائع کر رہی ہے۔

افسانہ ہجر و وصال | از مولانا ابوالکلام آزاد تقطیع بڑی۔ ضخامت ۲۴ صفحے کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا۔ قیمت ۴ر ملنے کا پتہ الہلال بک ایجنسی فاروق گنج بیرون شیرانوالہ دروازہ لاہور۔

یہ مضمون بھی الہلال میں شائع ہوا تھا اور اب الہلال بک ایجنسی نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ درحقیقت یہ ایک دردمند دل کی آہ ہے جو مسلمانوں کی موجودہ پستی غفلت اور بے حسی سے متاثر ہو کر نکلی ہے۔ زبان نہایت صاف، سادہ اور سلیس۔ اور طرز بیان پرجوش اور دلوں کو ہلا دینے والا۔

فن انشاپردازی | از جناب ڈاکٹر محی الدین صاحب اور قادری پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ۔ سائز بڑا ضخامت ۱۱۵ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا۔ قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔

یہ کتاب بقول جناب مصنف اس غرض سے لکھی گئی ہے کہ نوجوانوں میں صحیح ادبی ذوق نشو و نما پائے کتاب علاوہ مقدمے اور اشاریہ کے ۲۱ ابواب پر مشتمل ہے چند ابواب کے عنوان یہ ہیں۔ کیوں لکھیں کیا لکھیں۔ کس طرح لکھیں۔ اسلوب بیان۔ اپج پیدا کرنا بچوں کے لئے لکھنا۔ عورتیں اور انشاپردازی۔ وغیرہ زور صاحب نے کوشش کی ہے کہ تمام کام کی باتیں کتاب میں آجائیں بعض باتیں ایسی بھی کتاب میں درج ہوگئی ہیں، جو کچھ غیر ضروری سی معلوم ہوتی ہیں مثلاً اشاعت کے راز، مسودہ کی تشکیل وغیرہ تاہم نومشق نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

خواب پریشان | از مولنا عنایت اللہ بی اے دہلوی ۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ٹائٹل خوشنما قیمت ۴ ملنے کا پتہ شاہجہاں بک ایجنسی دہلی ۔

یہ دلچسپ قصہ بھی رسالہ ساقی میں شائع ہوچکا ہے اس میں ایک فلسفی حکیم صاحب کا خاکہ اوتارا گیا ہے ۔ اور پھر ایک خواب میں فلاسفہ یونان قدیم کے سامنے انھیں پھانسی دلوائی گئی ہے قصہ شروع سے آخر تک بہت دلچسپ ہے ۔ حکیم ہندی صاحب کا کیرکٹر بڑی خوبی سے کھینچا گیا ہے ۔ خواب کی عبارت بھی پڑھنے کے لائق ہے ۔

انکشاف حقیقت | از جناب صادق الخیری بی اے دہلوی ۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا قیمت ۴ ملنے کا پتہ شاہجہاں بک ایجنسی دہلی ۔

یہ دلچسپ افسانہ ساقی کے کسی پچھلے افسانہ نمبر میں شائع ہوچکا ہے ۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوجوان اور ایک خاتون میں جو فرضی ناموں سے رسائل میں مضمون لکھتے ہیں خط وکتابت کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے ۔ پھر ان دونوں میں یکا یک دو ایک ملاقاتیں ہوتی ہیں تعلقات بڑھتے ہیں اور شادی ہو جاتی ہے اور پھر شکر رنجی ۔ اس شکر رنجی کا اثر خاتون پر خاص طور پر پڑتا ہے وہ قریب مرگ ہو جاتی ہے ۔ اسی اثنا میں یک بیک یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ دونوں تو وہی ہیں جو پہلے فرضی ناموں خط کتابت کرتے رہے ہیں ۔ افسانہ بحیثیت مجموعی کامیاب ہے ۔ صادق الخیری صاحب کو افسانے لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے ان کے قلم میں بھی شگفتگی اور اثر ہے ۔

عروس ادب | از جناب قاضی عباس حسین صاحب ظریف دہلوی ۔ تقطیع چھوٹی ۔ ضخامت ۱۳۰ صفحے کتابت وطباعت وکاغذ اوسط ۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی ۔

یہ جناب ظریف صاحب کے اُن چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو شاہجہاں شباب اُردو اور ساقی میں شائع ہوکر سند قبول حاصل کرچکے ہیں فسانے خاصے دلچسپ ہیں ۔ دلی کی آسان اور

نکھری ستھری زبان میں لکھے گئے ہیں۔ موقع بموقع ظرافت کی چاشنی نے مزید لطف پیدا کر دیا ہے، فنی حیثیت سے بھی کامیاب ہیں۔ کرداروں میں بھی ایک خاص زندگی اور جان ہے۔ علاوہ اس کے ہر افسانہ کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ آخر میں چند ظریفانہ غزلیں بھی ہیں۔ بہت دلچسپ۔

تاریخی ناول (افغانی و انگریزی) | از جناب حافظ محمد حسین خاں صاحب بی اے سابق رئیس تدریسات افغانستان۔ تقطیع بڑی۔ ضخامت ۴۰۸ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط قیمت۔ ملنے کا پتہ حمید خاں بستی نو۔ جالندھر۔

اس ناول میں جناب حافظ محمد حسین خاں صاحب نے ناول کے پیرائے میں افغان اور انگریز مردوں اور عورتوں کے عادات و خصائل بڑی خوبی سے بیان کئے ہیں۔ قصہ ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے کا ہے جبکہ افغانستان بھی شور شوں کا مرکز تھا۔ انگریزی فوج کابل پر حملہ کر رہی تھی اور افغانی جوان مردد لیری سے ان حملوں کی مدافعت کر رہے تھے اسی اثنا میں ایک نوجوان افغانی اکرم پر ایک انگریز دوشیزہ کی نظر پڑ گئی اور وہ اس پر سو جان سے فدا ہو گئی۔ یہی حالت اکرم کی ہوئی تا آنکہ انگریز لڑکی مسلمان ہو گئی اور ان دونوں میں نکاح ہو گیا۔ اس سلسلے میں بہت سے دلچسپ، ہیبتناک واقعات پیش آئے ہیں جن کی تفصیل طوالت کا موجب ہوگی کتاب میں جگہ جگہ عیسائیت کے متعلق مناظرے بھی ہیں ان میں دلائل و براہین سے تمام مذاہب پر اسلام کی برتری اور فوقیت دکھائی ہے۔ افغانستان کے پرانے ملاؤں اور قاضیوں وغیرہ کی بھی خوب قلعی کھولی گئی ہے۔ حافظ صاحب نے یہ کتاب فنی اصول کو مدنظر رکھ کر نہیں لکھی اس لئے اگر اس قسم کے نقائص ہوں تو انھیں نظر انداز کر دینا چاہیے۔

اقتباس مثنوی | از جناب حافظ محمد حسین خاں صاحب سابق رئیس تدریسات افغانستان تقطیع چھوٹی

ضخامت ۲۳۰ صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط قیمت درج نہیں غالباً بستی نو جالندھر کے پتے پر جناب مصنف سے مل سکے۔

حافظ صاحب مثنوی مولانا روم کی ضخیم جلدوں میں سے یہ اقتباس کیا ہے شروع میں سبب اقتباس کے عنوان سے ایک نظم بھی ہے اُس میں فرماتے ہیں:۔

گل بچیدم خار را بگذاشتم ٭ برگ و غنچہ نرم نرم انباشتم
از عبارت عبرتے برداشتم ٭ گرچہ لازم جملہ را بپداشتم
برکہ دارد وقت خواند داستاں ٭ ورنہ بردارد نتیجہ ہائے آں

گلبو | از جناب حافظ محمد حسین خاں صاحب بی اے سابق رئیس تدریسیات افغانستان سائز چھوٹا ضخامت ۱۰۲ صفحے کتابت و طباعت معمولی کاغذ اوسط درجے کا قیمت درج نہیں غالب آبستی نو جالندھر کے پتے پر مصنف سے مل سکتی ہے۔

جناب حافظ صاحب نے گلستان اور بوستان کا انتخاب فرمایا ہے اور اُس کا نام گلبو رکھا ہے۔ طالب علموں اور کم فرصت لوگوں کے لئے اچھی چیز ہے۔

مکتوبات امجد | مرتبہ جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ سائز چھوٹا۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ شمس المطابع عثمان گنج حیدر آباد دکن۔

یہ حیدر آباد کے مشہور شاعر حضرت امجد کے خطوط کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے اپنے دوست احباب اور معتقدین کے نام لکھے تھے۔ شروع میں نواب جیون یار جنگ بہادر کا پیش لفظ اور ہاشمی صاحب کا ۲۲ صفحے کا مقدمہ ہے اس کے بعد اصل خطوط شروع ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ اور صاحب ذوق حضرات کے کام کی چیز ہے۔

حضرت محمد صلعم اور اسلام | از بابو کنج لال دلوالی ام اے۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۹۵ صفحات۔ کتابت و طباعت اچھی قیمت ۴ر ملنے کا پتہ بابو کنج لال دلوالی ام اے ملول (نزد دہلی)

۱۰ اگست ۲۹ء میں محمڈن ایجوکیشنل سوسائٹی کی طرف سے آنحضرت صلعم کے روز ولادت کی تقریب پر کوٹھا پور میں ایک جلسہ ہوا تھا بابو کنج لال اس کے صدر تھے انھوں نے اس روز ایک تقریر بھی کی تھی اور یہی صدارتی تقریر افادۂ عام کی غرض سے انھوں نے ترمیم و اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کر دی ہے۔ اس میں آنحضرت کے مختصر حالات ہیں اور ہندوؤں اور دوسرے فرقوں کی طرف سے اسلام پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اُن کے معقول۔ مدلل اور مسکت جوابات ہیں بابو صاحب نے اسلام اور اس کی تاریخ کا غور و توجہ اور چشم بصیرت سے مطالعہ کیا ہے اگر ہندوستان کے مختلف مذہبوں اور فرقوں کے لوگ اسی فراخ دلی سے دوسروں کے مذاہب کا مطالعہ کریں تو ان آئے دن کے جھگڑوں اور فسادوں کا نام و نشان ہی مٹ جائے جنھوں نے ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں بے شمار رخنے پیدا کر دئے ہیں۔ (م۔ح۔ح)

رسائل:۔

کامران (ماہوار) | ایڈیٹر حاجی نبی احمد صاحب و سید ولایت حسین صاحب تقطیع بڑی حجم ۴۰ صفحے کتابت و طباعت اچھی کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت سالانہ ۳ر فی پرچہ ۴ر مقام اشاعت دہلی۔

یہ پرچہ "مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی ہر جہتی ترقی" کے لئے نکالا گیا ہے۔ لیکن زیادہ تر توجہ "علمائے کرام" کی اصلاح کی جانب ہے۔ شروع میں مولانا راشد الخیری مرحوم کا مضمون ہے جس میں انسداد ارتداد کے بارے میں نہایت سنجیدہ مشورے دئے گئے ہیں اس کے بعد مولانا عنایت اللہ بی اے دہلوی نے ڈانٹے کے جہنم کے ایک حصے کا ترجمہ کیا ہے اور جیسی یہ کتاب کلاسکل ہے اسی طرح ترجمہ بھی ادب عالیہ میں شمار ہونے کے قابل ہے اس کے بعد تفاسیر القرآن کے عنوان سے مولانا اسلم کا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے مختصر طور پر تفسیر کے مدون ہونے کی تاریخ بیان کی ہے۔ پھر

ان تفسیروں کے نقائص بتائے ہیں۔ پھر جناب ص۔ ق دہلوی نے "دنیائے سعادت" کے نام سے ایک نئی دنیا بسائی ہے۔ اس کے بعد حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں مولویوں کو جی بھر کے ملاحیاں سنائی ہیں اور سب و شتم میں "علمائے کرام" سے زیادہ جرأت دکھائی ہے۔ پھر مولانا نیاز فتح پوری کے ارشادات میں ان کا انداز بھی یہی ہے۔ پھر حاجی نبی احمد صاحب نے ایک نظم میں مولویوں کے اخلاق کو کوسا ہے کچھ عرصہ ہوا دیوبند نے آں حضرت کی شہوانی طاقت پر کچھ ریسرچ کیا تھا (نعوذ باللہ) اس کی تفصیل اور اس پر نقد بھی اس پرچے میں موجود ہے پھر راجپوتانہ کے مسلمانوں کی زبوں حالی اور علماء و مشائخ کی خود غرضیوں کا تذکرہ ہے۔ پھر مکافات کے عنوان سے امر حسن کا ایک مضمون ہے۔ مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی نے ترجمہ کیا ہے آخر میں ہم کیا چاہتے ہیں اور مولویوں کے نام ہمارا پیغام کے زیر عنوان علمائے کرام کو مشورہ دیا گیا ہے کہ موجودہ حالات میں انھیں کیا کرنا چاہئے اور انھوں نے ہماری بات نہیں مانی تو ہم اُن کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ رسالہ بہت محنت اور سلیقہ سے نکالا گیا ہے۔ اور یہی توجہ رہی تو آئندہ اور ترقی کرے گا۔ لیکن جس مقصد کے لئے یہ نکالا گیا ہے اس کے حصول کے لئے یہ روش ہمارے خیال میں مناسب نہیں۔ آج کل قوم کی اصلاح کا احساس بہت شدت سے عام ہے ہمارے چند نوجوان مسلمانوں کی توجہ علمائے کرام کی اصلاح کی جانب مبذول ہوئی ہے اور یہ بہت اچھا مشغلہ ہے لیکن ہمارا خیال ہے اور شاید بہت سے پچھلے مصلحین کا بھی یہی تجربہ ہو کہ اصلاحی کام میں اکثر و بیشتر نرم گفتاری و خوش اخلاقی و درشت کلامی و غضبناکی کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ رسالے کے کارکن مضمون نگار اور شعرائے کرام ہماری گذارش کو ناقابل التفات نہ سمجھیں گے۔

ادب (محمود آباد نمبر) | مرتبہ جناب ناصر لکھنوی۔ تقطیع "جامعہ" کی ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اچھا۔ سرورق دیدہ زیب مقام اشاعت نظامی پریس۔ لکھنؤ۔

ادب کا ذکر ان ہی صفحات میں پہلے آچکا ہے۔ اب جناب ناصر لکھنوی نے مہاراجہ محمود آباد القابہ

کے جشن تاج پوشی کی تقریب میں محمود آباد نمبر کے نام سے اس کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اداریہ پیغامات اور رائوں کے علاوہ اڑتیس مضامین نظم و نثر ہیں۔ فرمانروائے محمود آباد دام اقبالہ دور مہاراج کمار بہادر محمود آباد دام اجلالہ کے ارشادات عالیہ بھی شریک اشاعت ہیں ان کے علاوہ جناب مرتب نے ملک کے تمام مشہور ادیبوں اور شاعروں کے کلام نظم و نثر سے اس پرچے کو زینت دی ہے۔ اور بڑے سلیقے سے اس گلدستے کو سجایا ہے رسالے کی ظاہری تزئین بھی اس کی شان کے مطابق ہے اور نظامی پریس اور اُس کے کارکن اس معاملے میں بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں رسالے میں گذشتہ و موجودہ فرمانروایان محمود آباد اور جشن تاج پوشی کے موقع کی تصویریں بھی ہیں۔

المؤسی (سہ ماہی) ایڈیٹر محمد افضل الدین و سید مہدی حسین۔ تقطیع بڑی، ضخامت ۱۲۰ صفحات سرورق خوب صورت مقام اشاعت دفتر المؤسی سٹی کالج حیدر آباد دکن۔

یہ رسالہ سٹی کالج کے طالب علم کئی سال سے بہت محنت اور توجہ سے نکالتے ہیں اس کا معیار بھی برابر بلند ہوتا جارہا ہے۔ زیر نظر نمبر اس کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ اس میں علاوہ طالب علموں کے بہت اچھے اچھے لکھنے والوں کے نام نظر آتے ہیں مثلاً جناب آغا حیدر حسن صاحب حضرت فانی بدایونی ہزا کسلنسی مہاراجہ سرکشن بہادر یمین السلطنت و صدر اعظم۔ آخر میں مدیر کے قلم سے کالج سنسار کے زیر عنوان کالج کی مختلف دلچسپیوں کی بہت دلچسپ انداز میں روداد بیان کی گئی ہے۔ ہم اس کامیابی پر طلبائے سٹی کالج خصوصاً اس کے مرتبین کو مبارک باد دیتے ہیں۔

دلچسپ (ماہوار) ایڈیٹر کرم چند و عبدالحمید۔ سائز بڑا۔ کتابت و طباعت اوسط درجے کی ضخامت ۴۶ صفحے۔ قیمت سالانہ ایک روپیہ۔ مقام اشاعت بمبئی۔

یہ باتصویر رسالہ بمبئی سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ مضامین عام مذاق کے ہوتے ہیں۔ تصویروں کا بھی انتظام ہے۔

تاج (ہفت روزہ) | مرتب حضرت نشتر جالندھری و قربان علی کاظم طباعت و کتابت اور کاغذ اچھا ٹائٹل دیدہ زیب۔ قیمت سالانہ تین روپے مقام اشاعت لاہور۔

یہ اخبار تاج کمپنی لاہور کی طرف سے نکلنا شروع ہوا ہے زیر نظر پرچہ جلد کا پہلا نمبر ہے۔ شروع میں " تاج کے خیر مقدم" کے عنوان سے جناب خاں صاحب ابو الاثر حفیظ جالندھری صاحب کی ایک نظم ہے۔ دوسرے صفحے پر " جنگ بدر" کی تفصیل ہے پھر آغاز سفر کے عنوان سے افتتاحیہ ہے جو جناب نشتر نے بڑے جوش اور ولولے سے لکھا ہے پھر شذرات ہیں۔ اس کے بعد خبروں کا انتخاب ہے۔ پھر خاموش خلیل کے عنوان سے ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ تمتر و دیا پر حضرت سالک کا ایک دلچسپ مضمون ہے۔ اس کے بعد مسلمان بچیوں کی تعلیم کی ابتدا پر ممتاز رفیع بیگم صاحبہ نے ایک مضمون لکھا ہے۔ پرچہ بہت محنت اور سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے اور نشتر صاحب کی یہی توجہ رہی تو آئندہ اس سے بہت کچھ امیدیں قائم کی جا سکتی ہیں۔

رہنما (ہفت روزہ) رئیس التحریر ابو سعید صاحب بزمی ام اے کتابت و طباعت معمولی۔ قیمت سالانہ ہے مقام اشاعت بھوپال۔

یہ اخبار بھوپال کے عوام کا ترجمان ہے افسران حکومت پر آزادی سے نکتہ چینی کرتا ہے۔ لب و لہجہ متین و سنجیدہ ہے۔ (م۔ ح۔ ح)

دکن کے زمانہ ماقبل تاریخ کی یادگاریں | از غلام یزدانی صاحب، ایم اے، ایف اے ایس بی، ناظم محکمہ آثار قدیمہ سرکار عالی و ماہر کتبات اسلامیہ، سرکار عظمت مدار سلسلہ مطبوعات سرکار عالی۔ حجم ۱۰۰ صفحے، قیمت ۱۰/۔ باتصویر۔

یہ نہایت ہی دیدہ زیب رسالہ غلام یزدانی صاحب کی ایک تقریر ہے جو انھوں نے ۷ ستمبر ۱۹۳۹ء کو حیدرآباد کے ریڈیو اسٹیشن سے کی تھی۔ دہلی کی طرح حیدرآباد میں بھی ریڈیو کی تقریروں کا مختصر ہونا شرط

ہے اور سب کچھ دیکھتے ہوئے بہتر بھی یہی ہے، پھر بھی جب غلام یزدانی صاحب کی سی قابلیت اور وسیع معلومات رکھنے والے ریڈیو کو اپنی تقریر کا شرف بخشیں تو جی چاہتا ہے کہ ایسا کوئی قاعدہ نہ ہوتا۔ رسالہ کے اختصار کا سبب یہی ہے۔ لیکن ان دس صفحوں میں دکن کے زمانہ ماقبل تاریخ کی نسبت جو کچھ معلوم ہو جاتا ہے اس کے آگے ہے بھی بہت کم۔ یزدانی صاحب مختصر تقریر کریں یا کوئی اور موٹی کتاب لکھیں، پڑھنے والے کو حاصل قریب قریب اتنا ہی ہوگا۔

زندوں کا حال مردوں سے معلوم کرنا، زندگی کا آثار قدیمہ سے، مکانوں کا قبروں سے اور مقبروں سے، بڑا مشکل اگرچہ بہت ہی دلچسپ کام ہے۔ جب حقیقت تک پہنچنے کی کوئی صورت نہ ہو تو اسی مشکل دلچسپی کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اور اب تک ہندوستان اور دکن کے آثار قدیمہ کے محکموں سے علم تاریخ کو جو فیض پہنچا ہے وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ غلام یزدانی صاحب کے شوق اور محنت کی بدولت ریاست حیدر آباد کے محکمہ آثار قدیمہ نے جو علمی خدمات انجام دی ہیں ان کا اندازہ اس محکمے کی سالانہ رپورٹوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے، مگر شمالی ہندوستان میں ان خدمات کا اعتراف بھی کیا جائے تو ذکر نہیں کیا جاتا۔ سبب نہ پوچھیے، بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بہر حال، یہ تو ثابت ہے کہ ریاست حیدر آباد اور برطانوی ہند کے محکمہ آثار قدیمہ نے جو انکشافات کئے ہیں انھوں نے قدیم تاریخ ہند کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ اب نہ آریوں کی قدامت کوئی ایسی قدامت رہی ہے، نہ ان کا مذہب خالص، نہ تہذیب دوسروں سے بہتر۔ ایک محقق کی رائے میں تو نہ ان کا رنگ صاف تھا نہ ناک اونچی نہ ڈیل لامبا، یعنی وہ باہر سے نہیں آئے تھے، یہیں کے لوگ تھے، دوسروں کو جنھیں وہ اپنے مخالف جانتے تھے انھوں نے جی میں آیا تو غلام اور جی میں آیا تو بھوت پریت کہہ دیا۔ ان کی زبان ایک خاص مت کی زبان تھی اسے سمجھنے والے وہی تھے جن کا خود ستائی میں فائدہ تھا، لہذا انھوں نے جیسا چاہا قانون بنایا اور جس کو چاہا دیوتا بنایا۔ یہ بہت بعد کی بات ہے کہ انھیں اپنے دیوتاؤں کو چھوڑ کر دوسروں کی پرستش کرنے میں اپنا فائدہ نظر آیا۔ یعنی انھوں اندر اور ورن سے منہ پھیر کر شو اور وشنو (کرشن) کو سجدہ کیا اور اپنی لاج رکھنے کے لئے دیوتاؤں کے نسب نامے اور تخصیص علامات کو

نئے تاریخی نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے یزدانی صاحب کا یہ مختصر رسالہ بہت مفید ہوگا۔ اس میں وہ خیال آرائیاں نہیں ہیں جن کی طرف آثار قدیمہ کے اکثر ماہر مائل ہوتے ہیں، اس لئے کہ یزدانی صاحب بہت محتاط عالم ہیں، اور شہرت حاصل کرنے کی اس دبا سے محفوظ ہیں جو شمالی ہندوستان کیا ساری دنیا میں علم کاذب کی علامت ہے۔

"نظام الملک آصف جاہ"

(مصنفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لٹ (پیرس) پروفیسر جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد۔ حجم ۲۱۶ صفحے

قیمت چھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ درج نہیں ہے۔)

یہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی پہلی انگریزی تصنیف ہے، مگر اسی پہلی کوشش سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تحقیق کے فن میں ماہر ہیں، اپنی معلومات اور مطالعہ سے خود پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اسے دوسروں تک پہنچا بھی سکتے ہیں۔ اب تک سلطنت مغلیہ کے زوال کے ابتدائی دور پر انگریزی میں صرف اروائن کی کتاب تھی، جو مفصل تو ہے مگر اس کی تفصیل سے الجھن ہوتی ہے، اس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ فلاں سفر میں کہاں کہاں پر منزل کی گئی، کون خیمے کی رسی لایا اور کس نے میخ ٹھوکی، دو چار درباریوں کی سیرت کا بھی اس میں خاکہ کھینچا گیا ہے، لیکن وہ ہے خبروں کا ایک بے جان اور اس لئے مہمل مجموعہ۔ اور نظام الملک کی سیرت اس میں کسی وجہ سے نظر انداز بھی کی گئی ہے، یا اگر مصنف کی نیت یہ نہ تھی کہ اجڑی محفل کے آخری چراغ کی روشنی بھی دھیمی کردے، تو اس کا معیار ایسا تھا جس نے جلتے اور بجھے ہوئے چراغوں میں فرق کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بہرحال یوسف صاحب کی کتاب ایک بہت بڑی کمی پوری کرتی ہے، اور تصنیف کی حیثیت سے تاریخ نویسی کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

نظام الملک آصف جاہ کے دادا، خواجہ عابد شاہ جہاں کے آخری سالوں میں ہندوستان آئے، اور اسی زمانے سے ایک طرف وفا شعاری اور قابلیت اور دوسری طرف قدر دانی اور مردم شناسی کی وہ داستان شروع ہوتی ہے جو سلطنت مغلیہ کے عہد زوال کی سب سے ہمت افزا کہانی ہے۔ اس کا انجام اس اعتبار سے تو دردناک تھا کہ نظام الملک کی شخصیت اور حکمت عملی کام نہ آئی، اور مغلیہ سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، لیکن یہ کیا کم تھا کہ ایسے وقت میں جب قوت اور عزت ہاتھ سے جا رہی تھی، ایک ایسا شخص پیدا ہوا جسے نہ غدار دوست نقصان پہنچا سکے نہ کھلے دشمن، جس نے ایک

نااہل بادشاہ کی آبرو قائم رکھی، کمینوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کبھی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی، اور خود غرضیوں اور حماقتوں میں گھر کر بھی کبھی سیدھے ایمانداری کے رستے سے ایک قدم نہ ہٹایا۔ ریاست کے وفادار اور جاں باز خادم اور بھی تھے، جو محمد خاں بنگش کی طرح تباہ ہوئے، اس لئے کہ وہ ہر داؤ پر سب کچھ لگا دیتے تھے اور کھیل میں ماہر نہ تھے، ان کی شکست میں بے شک مردانگی کی شان نظر آتی ہے مگر دنیا میں مردانگی کے علاوہ اور اوصاف بھی درکار ہوتے ہیں۔ نظام الملک شمالی ہندوستان کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے نہیں بچا سکا، نادر شاہ کو نہ روک سکا نہ لوٹا سکا، پر یہ کیا کم ہے کہ اس نے دکن کے صوبے کو مرہٹوں سے پاک کر دیا، اور اس وقت جب کہ اس کا سر جھکانے والا کوئی نہ تھا اس نے بزرگوں کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اپنا سر جھکائے رکھا، اور شاہان مغلیہ کی آبرو رکھ لی۔ ہوشیار سپہ سالار بھی یہی کرتے ہیں کہ جب پوری فوج کو بچانے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو ایک حصے کو بچالیتے ہیں اور اسے کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دیتے ہیں۔

یوسف صاحب کی تصنیف تحقیق کے موجودہ معیار پر پوری اُترتی ہے، ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اور کتب خانہ آصفیہ اور دفتر دیوانی میں انھیں قلمی کتابوں اور کاغذات اور اسناد کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مل گیا ہے جو دوسرے مورخوں کو میسر نہ تھا۔ اس ذخیرے سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے، اور ان کی کتاب نہایت مستند ہے۔ ان کے طرز تحریر میں بھی ایک محتاط عالم کا انداز نظر آتا ہے، اور اگرچہ وہ اپنے ہیرو کے بہت معتقد معلوم ہوتے ہیں، انھوں نے ہمیشہ اس عقیدت کو ثبوت اور سند کا پابند رکھا ہے۔ ان کے اس احتیاط سے نظام الملک کی شخصیت گھاٹے میں نہیں رہتی، کیونکہ پس منظر صاف ہو تو اصل تصویر خود بخود اُبھر آتی ہے، اور یوسف صاحب پس منظر کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ نظام الملک کی عاقبت بینی اور مصلحت اندیشی کو بھی نمایاں کرتے رہے ہیں۔ ان کی تصنیف میں کوئی کمی محسوس ہوگی تو انھیں لوگوں کو جو "شاعری" کو تاریخ کا رس سمجھتے ہیں اور اس کی خاطر متین اور سنجیدہ عالموں کی گھڑکیاں بھی سہنے کو تیار ہوتے ہیں۔

نذرِ حسینؑ

رُباعی

آنکھیں غمِ شبیرؑ میں تر ہیں دونوں
ہم پہلوئے درد، دل جگر ہیں دونوں
عاشورہ و چہلم کی عزاداری سے
یک رنگ، محرّم و صفر ہیں دونوں
لیتا ہے شقی کا نام کب کوئی کہیں
لیکن، لقبِ سعد ہے ہر دل میں مکیں
ہے نامِ بد و نیک کی نسبت کا یہ فرق
لاکھوں میں حُسینؑ، اور یزید ایک نہیں

سلام

کیا پوچھتا ہے کوئی محرم میں کیا ہُوا
گھر کربلا میں، ذبح شہِ کربلا ہوا
یہ جشنِ کربلا کی زمیں میں بپا ہوا
بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا جدا ہوا
کیوں نہ فرشِ کربلا کو یہ عرشِ عُلا کہوں
ہے سلسلہ نبی سے خدا تک ملا ہوا

قطعہ

احوالِ کربلا سبق آموزِ عام ہے
دنیا پر اُس کے فیض کا در ہے کُھلا ہوا
لیکن طلسم ساز، فریبِ نگاہ ہے
آنکھوں پہ غفلتوں کا ہے پردہ پڑا ہوا
اُٹھ جائے یہ حجاب تو پھر جائے یہ عیاں
ہر ذرّہ ہے چراغِ ہدایت بنا ہوا

جنگِ حسینؑ تھی نہ زر و مال کے لئے — تھا اُن کے سامنے یہ تخیل گرا ہوا
وہ صبر، وہ ثبات، وہ تسلیم، وہ رضا — جس کا نشان بعدِ نبیؐ تھا مٹا ہوا
وہ جوشِ دیں، وہ جذبۂ للّٰہی، وہ عزم جزم — اسلام جس کے بل پہ قوی القوا ہوا
ابلاغِ دینِ مطلق و اعلائے امرِ حق — باطل کا جس کے سامنے سر تھا جھکا ہوا
اِن حسیات کی حرکت ہو رہی تھی بند — اور انجماد کا تھا اثر بھی بڑھا ہوا
وہ جوش، جان دے کے اُبھارا حسینؑ نے — جو سنگِ بے حسی میں پڑا تھا دبا ہوا
پروانہ ان کو زر کی، نہ خواہش تھی مال کی — تھا مال و زر تو قدموں سے اُن کے لگا ہوا
تھے وہ تو شاہزادۂ شاہنشہِ دو کون — سب کچھ تھا اُن کے پاس خدا کا دیا ہوا
کرتے وہ کیا طلب کسی حق ناشناس سے — اُن کے لئے خزانۂ حق تھا کھلا ہوا

احسن یہ بوترابؑ کی ہیں فیض بخشیاں
جو اُن کے در کی خاک ہوا کیمیا ہوا

ارشاداتِ ثاقبؔ

اس کے نیرنگ کا تماشا ہوں — جز فریبِ نگاہ، میں کیا ہوں
عشق میں دِل گنوا کے حال یہ ہے — کچھ میں کھویا ہوا سا رہتا ہوں
پرسشِ حال اس نے کی تو مجھے — یہی کہتے بنا کہ اچھا ہوں

دل تھا غم کا فسانہ خواں نہ رہا — اب کوئی لطفِ داستاں نہ رہا
ہم کہیں کس سے اور سمجھے کون — جب کوئی اپنا ہمزباں نہ رہا

کس منھ سے زباں کرتی اظہارِ پریشانی — جب تم نے مری حالت صورت سے نہ پہچانی
رازِ غمِ الفت ہم سمجھے تو مگر چپ ہیں — کہنے میں نہیں آتی جو بات ہو وجدانی

ظلم اپنوں پر جفا جو کس لئے — اے فلک! شبنم کے آنسو کس لئے
ڈھونڈتے ہیں سب تجلّی گاہِ دوست — قمریوں کی ورنہ کوکو کس لئے
خواہشِ دنیائے عشق و حسن ہے — ورنہ پھر میں کس لئے، تو کس لئے

دل کے قصے کہاں نہیں ہوتے — ہاں وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے
ایک ہی طرح کے ہیں دیر و حرم — غم کے مارے کہاں نہیں ہوتے

سلیم الزماں نے دوا دی ہے ثاقبؔ — جو مخصوص ہے بہرِ عودِ جوانی
یہاں گوشۂ قبرِ دل ڈھونڈتا ہے — کہ ہے تلخ تر موت سے زندگانی

سنہری موقعہ

بجلی کے صیغہ کے ملازمین کی تنخواہ میں پچاس فی صدی اضافہ

بجلی کے صیغہ میں کام کرنے والے مستریوں۔ الیکٹریشنوں۔ وائرمینوں۔ لائن مینوں۔ الیکٹرک فرٹروں۔ میٹر ریڈروں وغیرہ وغیرہ کی کامیابی اور بہبودی کے لئے تحریر کیا جاتا ہے۔ کہ جو ملازمین کسی بجلی کی تعلیم گاہ کے باقاعدہ سند یافتہ نہ ہوں اور اپنے عملی تجربہ کی وجہ سے بجلی کے کام میں خاصی مہارت رکھتے ہوں وہ ہماری درس گاہ کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کر کے اپنا عہدہ بڑھوا سکتے ہیں۔ جس سے ان کی تنخواہ میں کم از کم پچاس فیصدی اضافہ ہو سکتا ہے۔

انسٹیٹیوٹ ہذا میں ان کی قابلیت کے معیار کے مطابق پرائیوٹ امتحانات وغیرہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ بجلی کے محکمہ کے اکثر ملازمین ہمارے امتحانات پاس کر کے اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے ہیں۔ ضرورت منداصحاب مندرجہ ذیل پتہ سے خط و کتابت کریں۔

مینیجر پنجاب انجنیرنگ انسٹیٹیوٹ جالندھر شہر

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن

دوسری جلد

سورۂ اعراف سے سورۂ مومنون تک

یہ جلد اپنی نوعیت میں پہلی جلد سے بھی زیادہ مہتم بالشان ہے۔ یعنی حواشی زیادہ مفصل اور دل کش اور اہم مسائل پر مشتمل ہیں۔ طباعت و کتابت بھی بہتر ہے۔ چونکہ سورۂ یوسف، انفال، توبہ، کہف، مریم، انبیاء وغیرہ اس حصے میں آگئی ہیں اور مولانا کو کتابت کے جدید انتظام کے باعث جی کھول کر بحث کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس لئے کتاب اپنے رنگ میں بے نظیر ہوگئی ہے۔

ھدیہ بلا جلد ۶؎ مجلد ۶؎

جلد اول صرف مجلد مل سکتی ہے ھدیہ ۶؎

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

رجسٹرڈ نمبر

اِل - ۱۸۹۲



جامعہ

اُردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین - ایم اے، پی ایچ - ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

قیمت سالانہ صر

مطبع جامعہ دہلی

فی پرچہ ۸ر

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ، ڈی و پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۲۵ | جنوری سنہ ۱۹۳۶ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

پستالوزی کا نظریۂ تمدّن

پستالوزی نے اپنے زمانے کے تمدن کی تنقید اور اس کا ایک جدید نصب العین اپنی معرکۃ الآرا کتاب "ایک خلوت گزیں کے لمحات شام" میں پیش کیا ہے۔ موصوف کے مدرسے کی ناکامیابی نے پستالوزی کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنے خیالات وضاحت کے ساتھ پیش کرے اور یہ ثابت کرے کہ مدرسہ کا قیام ضروری تھا، گو خارجی اسباب کے باعث اس کو ناکامیابی ہوئی۔ مدرسے کے قیام کے زمانے میں اسے اس کا موقع نہ ملا کہ وہ اپنے خیالات اچھی طرح لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ مدرسے کی ضرورت اس کی نظر میں اس قدر بدیہی تھی کہ اس کا ثبوت دینا غیر ضروری خیال کرتا تھا۔ پھر اس کو عملی کام کے مقابلے میں نظری مباحث سے زیادہ دلچسپی بھی نہ تھی۔ لیکن جب مدرسہ بند ہوگیا اور چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی تو پستالوزی نے اس کی ضرورت سمجھی کہ وہ ان مقاصد کا ذکر کردے جنھوں نے اس کو ایک مدرسے کے قیام پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی تصنیف کی سرخی ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس درد اور غم کے عالم میں پستالوزی نے یہ خیالات سپرد قلم کئے ہیں "ایک خلوت گزیں کے لمحاتِ شام" اس کتاب کا بہت مناسب نام ہے۔ شام کے لمحات طبیعت کی افسردگی اور پستی کے لمحات ہوتے ہیں جب کہ انسان کے قویٰ اور اس کا دماغ تھک چکا ہوتا ہے۔ تمام دن کی جدوجہد کے بعد زندگی کو شب کی تاریکی اپنے آغوش میں چھپا لینا چاہتی ہے آفتابِ عالم تاب جس کی کرنوں نے تمام دنیا کو حیات تازہ بخشی تھی، جس نے کائنات کے ذرے ذرے میں روح زندگی پھونکدی تھی، پردۂ شب میں نہاں ہو جاتا ہے۔ ایک مایوس اور تھکے ہوئے ناکامیاب انسان کی زندگی کو لمحات شام سے بہتر کوئی دوسرے الفاظ ظاہر نہیں کرسکتے تھے "لمحات شام" کے ہر جملے میں پستالوزی کے تلخ تجربات کی جھلک نظر آتی ہے، لمحات شام سمجھنے کے لئے ضروری ہے انسان لین ہارڈ اور گرٹروڈ کا پہلا اور دوسرا

حصہ پڑھ چکا ہو۔ لمحات شام میں پستالوزی نے جماعت کا ایک نصب العین پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان اپنی فطرت اعلیٰ کی تکمیل سے کیا ہو سکتا ہے۔ لین ہارڈ اور گرٹروڈ میں جماعتی زندگی کی اصلی تصویر پیش کی گئی ہے یعنی اس میں انسان کی صرف فطرتِ اعلیٰ ہی نہیں دکھائی گئی ہے بلکہ اس کی فطرت ادنیٰ بھی انسان کی اعلیٰ اور ادنیٰ فطرت کا کوئی ہم آہنگ نظام موجود نہیں ہے۔ پستالوزی تقریباً پندرہ برس کوشش کرتا رہا کہ وہ کسی طرح جماعتی زندگی میں ایک توازن پیدا کر دے۔ پہلے اس نے حکومت اور قانون کے ذریعے اس کی کوشش کی جب اسے اس میں ناکامیابی ہوئی تو وہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوا۔ پستالوزی تمام عمر اس کی تحقیق کرتا رہا کہ انسان کی فطرت خیر پر مبنی ہے یا شر پر؟ اس کتاب میں بھی پستالوزی کے پیش نظر یہی بنیادی مسئلہ ہے۔ پستالوزی کی سب سے اعلیٰ فلسفیانہ تصنیف "تحقیقات فطرت انسانی" میں بھی یہی مسئلہ زیر بحث ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک پستالوزی کے پیش نظر حقیقت انسان ہی کا مسئلہ رہا۔

مسئلہ فطرتِ انسانی

ظاہر ہے کہ جب تک کوئی شخص فطرت انسانی کی حقیقت کو نہ سمجھتا ہو، اس کے قوانین سے واقف نہ ہو، وہ کس طرح جماعتی زندگی میں حصہ لے سکتا ہے۔ یا اس کی رہنمائی کر سکتا ہے؟ یا وہ کس طرح انسان کی تعلیم و تربیت کر سکتا ہے؟ "لمحات شام" میں پستالوزی لکھتا ہے کہ "انسان کیا ہے، اس کو کس چیز کی ضرورت ہے، کونسی چیز اس کو اعلیٰ کرتی ہے اور کونسی ادنیٰ۔ کونسی اس کو قوی کرتی ہے اور کونسی ضعیف۔ قوموں کی رہنمائی کرنے والوں کو بھی اس کے جاننے کی ضرورت ہے اور ادنےٰ جھونپڑوں میں رہنے والے بھی اس علم کے محتاج ہیں۔

اس کتاب کی تمام عبارت ایک الہامی انداز میں لکھی گئی ہے۔ صداقت اور جوش ہر جگہ ٹپکا پڑتا ہے۔ خاص اور اہم خیالات نہایت مختصر مگر موثر جملوں میں ادا کئے گئے ہیں، اس کتاب کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان پستالوزی کے خیالات کی داخلی بنیادوں سے واقف ہو۔

فطرت کا تصور جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، اس کتاب میں پیش پیش ہے۔ اکثر پستالوزی

فطرت سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے گویا وہ ایک مجسم انسان ہے۔ بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت سے مفہوم انسان کا شخصی ارادہ ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ "اے عظیم الشان فطرت تیری تربیت میں میری خوشیاں اور میرے فرائض مضمر ہیں" بعض اوقات وہ خدا اور فطرت کے تصور کو ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے مثلاً کہتا ہے کہ انسان کی جھونپڑی میں رحمت الٰہی باپ کی طرح موجود ہے۔ خدا میری ہستی کے انتہائی عمق میں پنہاں ہے ..... اور یہی فطرت کی اصل قوت ہے" نہ صرف پستالوزی کے لئے بلکہ اس عہد کی تمام ذہنی زندگی کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اصطلاح فطرت کو واضح طور پر اپنے پیش نظر رکھیں۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں مذہب کا اثر کم ہو رہا تھا اور خدا کا تصور متزلزل لیکن مذہبی جذبہ چونکہ انسانی فطرت میں داخل ہے اس لئے اس کا اظہار دوسرے ذریعے سے ہوا۔ انسان ایک ما فوق الطبیعی ہستی کا عقیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ اپنے ایام مصیبت میں اس سے امداد کا طالب ہونا چاہتا ہے اور ایام خوشی میں اس کا ممنون اور متشکر۔ مغرب کے عہد جدید میں ذہن انسانی عام طور پر کلیسا سے بغاوت کر چکا تھا۔ اور کسی قسم کی قیود کا پابند نہیں رہنا چاہتا تھا۔ تاہم وہ مذہبی جذبے سے خود کو آزاد نہیں کر سکتا تھا اس زمانہ کے انسان نے اپنے اس مذہبی جذبے کو فطرت قرار دیا۔ اور اسی فطرت کو خدا کہہ کر پکارا "فطرت" کا جو مفہوم پستالوزی کے یہاں ہے وہی کانٹ کے یہاں "عقل" کا، شیلنگ کے یہاں "نفسِ مطلق" کا، ہیگل کے یہاں "ذہن مطلق" کا ہے۔ مذہبی جذبہ لاشعوری طور پر ان تمام فلسفیوں کی زندگیوں میں کام کر رہا تھا۔ مگر بظاہر اس نے ایک غیر مذہبی شکل اختیار کر لی تھی۔

دقت یہ ہے کہ "فطرت"، "نفس مطلق"، "ذہن مطلق"، "عقل" وغیرہ مابعد الطبیعاتی اصطلاحات بھی ہیں اور نفسیاتی بھی۔ وہ انسان سے بھی تعلق رکھتی ہیں اور خدا سے بھی۔ اصطلاح فطرت کی اس دوئی کی وجہ سے پستالوزی کے خیالات کو سمجھنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ فطرت کے دو پہلو ہیں۔ ایک داخلی اور ایک خارجی۔ فطرت داخلی وہ ہے جو تمام صوفیہ کی توجہ کا موضوع رہی ہے یعنی انفرادی نفس جس کے ذریعے حقیقت کا بلا واسطہ ادراک کیا جا سکے۔ پستالوزی کہتا ہے کہ حقیقت کا ادراک میری داخلی فطرت کر سکتی

ہے۔"

فطرتِ خارجی وہ ہے جس کا اظہار تمام نوع انسان کی زندگی میں ہوتا ہے۔ اپنے نفس کے ادراک کے لئے تمام انسانی زندگی کا مطالعہ ضروری ہے۔ پستالوزی کہتا ہے کہ "انسان خود کو جب پہچان سکتا ہے جب وہ تمام زندگی کو بحیثیت کلی اپنے پیش نظر رکھے۔ اسی بنا پر پستالوزی نے اپنے اصول تعلیم یہ مقرر کیا تھا کہ "زندگی کو انسان کا علم ہونا چاہئے"

صوفی کی نظر فطرتِ داخلی پر اور عملی آدمی کی نظر فطرت خارجی پر رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نفس انسان کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ فطرت کے دونوں پہلو ایک دوسرے کی مدد کریں۔ انسان اسی وقت کامل ہو سکتا ہے جب وہ اپنی داخلی زندگی کی تربیت کرے۔ لیکن اس طرح کہ خارجی دنیا سے اس کا تعلق برقرار ہے۔ خارجی دنیا کی کثرت کو اپنے نفس کی وحدت کی آنکھ سے دیکھنا سیکھے۔ خدا سے اپنا تعلق قائم رکھتے ہوئے اس دنیا کے کاموں میں پورا پورا حصہ لے۔

۲۔ مسئلہ "نامی تعلیم"

پستالوزی نے دوسرا اہم تصور "لمحات شام" میں نامی تعلیم کا پیش کیا ہے۔ انسان چونکہ زندہ اور نامی ہے اس لئے اس کی تعلیم بھی نامی ہونی چاہئے۔ فطرت ایک زندہ چیز ہے۔ اس کا اظہار ہر جگہ ہوتا ہے۔ روسو اور پستالوزی کے قبل تعلیم کا یہ تصور تھا کہ ذہن انسان ایک صندوق کے مانند ہے جس میں باہر سے اشیا داخل کی جا سکتی ہیں۔ یہ تصور مشہور انگریز فلسفی اور ماہر تعلیم لاک کا بھی تھا۔ بچے کے جذبات اور احساسات کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی اور نہ اس کا خیال تھا کہ اس کی نشو و نما اور تربیت کے کوئی علٰحدہ قوانین ہیں۔ بچے کی زندگی کی مستقل حیثیت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ جس کی بالذات کوئی اہمیت ہو اور جس کا ایک علٰحدہ مقصد ہو۔ بچا ایک چھوٹا سا آدمی تصور کیا جاتا تھا، اور اس کی تعلیم بالغوں کی طرح کی جاتی تھی۔ روسو اور پستالوزی نے اس خیال کی جس کو میکانیکی کہا جا سکتا ہے، سخت مخالفت کی، اور اس کے بجائے ایک نامی نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کے نزدیک بچے کی نشو و نما ایک درخت کے مانند ہوتی ہے جو اپنی نشو و نما کے مخصوص قوانین رکھتا ہے، انسان

کو ان قوانین کا مطالعہ کرنا چاہئے اور اُن کی پیروی کرنی چاہئے۔ اُسے بچوں کی تعلیم میں اس مقررہ راہ عمل سے علٰحدہ نہ ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ ان کی تمام زندگی برباد کردے گا۔ اور ہر انسان کو خود بھی اپنی زندگی میں اس فطری اصول کی پیروی کرنی چاہئے۔ ورنہ اس زندگی کا تمام امن و سکون برباد ہو جائے گا۔

انسان کی اصلی تعلیم اس وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب اُسے فطرت سے سابقہ پڑتا ہے، فطرت انسان کی تعلیم جسمانی حواس سے شروع کرتی ہے اور تدریجاً ذہنی اور روحانی تعلیم تک پہنچتی ہے۔ بچہ شروع ہی میں اپنی ماں کا دودھ پیتا ہے۔ اس طرح اس کی ایک جسمانی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اور اُسے ماں کی محبت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ پستالوزی کہتا ہے کہ اس جسمانی محبت کے حس کو ہمیں رفتہ رفتہ ترقی دینی چاہئے تاکہ بعد میں بچہ انسانیت اور خدا سے محبت کرے جس طرح ماں بچے کی چند ضروریات پوری کرتی ہے۔ اسی طرح خدا اس کی تمام جسمانی، ذہنی روحانی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس لئے بچے کے دل میں خدا کی محبت تدریجاً پیدا کرنی چاہئے فطرت غیر شعوری طور پر انسان کی نصف تعلیم کرتی ہے، لیکن چونکہ اس کی نصف تعلیم باقی رہ جاتی ہے اس لئے انسان کو شعوری طور پر اس فرض کو ادا کرنا چاہئے

پستالوزی تعلیم کی دو قسمیں کرتا ہے، ایک سطحی اور ایک عمیق۔ سطحی تعلیم وہ ہے جسے ہم ذہنی تعلیم کہتے ہیں۔ اس کے ذریعے صرف اشیا سے واقفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی ماہیت کا علم نہیں ہوتا، عمیق تعلیم وہ ہے جو اشیاء کی ماہیت بتاتی ہے اور اس کے ذریعے انسان حقیقت اعلیٰ سے یعنی، خدا سے تعلق پیدا کرتا ہے جو نفس انسانی اور کائنات کا مرکز و مقصد ہے۔ سطحی تعلیم صرف اشیا کے سائے سے واقفیت پیدا کرتی ہے، اصلی اشیاء سے نہیں۔ سطحی تعلیم انسان کو مغرور، غیر مستقل مزاج اور غیر مطمئن بنا دیتی ہے، پستالوزی اپنے زمانے کی تعلیم کو سطحی کہتا ہے اور اس کے خیال میں وہ تمام متذکرہ بالا عیوب کا سرچشمہ ہے۔ بخلاف اس کے عمیق تعلیم اشیاء کی ماہیت سے واقف کرتی ہے۔ اس سے انسان کو اپنی صحیح قدر کا اندازہ ہوتا ہے، اور اس

میں غرور کی بجائے انکسار، متانت، محبت اور شفقت پیدا ہو جاتی ہے، عمیق تعلیم سے جہاں داخلی قویٰ کی نشو و نما ہوتی ہے، اور وہ ایک رشتے میں مربوط ہو جاتے ہیں۔ وہاں خارجی دنیا کی اشیاء کو بھی ایک نظام کے تحت میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس تعلیم کی بدولت انسان اشیاء کو جدا جدا دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ ان پر کسی ایک اعلیٰ مقصد کے تحت میں غور بھی کرتا ہے

پستالوزی کے نزدیک تعلیم کا سب سے بڑا مقصد داخلی سکون ہے، جو قویٰ داخلی کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی داخلی سکون تصوف و مذہب کی جان ہے۔ داخلی سکون کے لئے پستالوزی داخلی جذبے کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے۔ اور اس لفظ کو اس نے "لمحاتِ شام" کے چند اوراق میں کوئی دس مرتبہ دہرایا ہے۔ اسی داخلی جذبے سے بعد میں پستالوزی کا تصور "ادراک" پیدا ہوا۔ "ادراک" داخلی جذبے ہی کا نام ہے، البتہ اس میں چند ذہنی اور عقلی عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں، پستالوزی کے طریقۂ تعلیم کا سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں ہے کہ وہ اس "داخلی جذبے"، "داخلی کیف" و "داخلی سکون" یا "ادراک" کو مختلف مضامین کی تعلیم کے ذریعے حاصل کرے۔ انسان کی یہ فطری اور اصلی کیفیت ہے اس لئے لازماً وہ سادہ ہو گی اور اخلاقی اصطلاح میں اسی کو معصومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ پستالوزی کہتا ہے کہ فطرت ہی خدا ہے اور وہی نفس انسانی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کا انسان میں ظہور ہوتا ہے۔ نفس انسانی کی قوتیں اصل میں خدائی قوتیں ہیں۔ انسان کو اپنے نفس کی قوتوں کی نشو و نما کرنی چاہئے۔ اور جن قوانین کے مطابق نفس انسانی نشو و نما پاتا ہے ان کی پابندی کرنا چاہئے۔ ان قوانین سے علیحدگی اختیار کرنا گویا خدا سے علیحدگی اختیار کرنا ہے۔

انسان نہ صرف مخصوص قوتوں کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا گیا ہے، بلکہ وہ ایک مخصوص ماحول میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس ماحول سے اس کو علیحدگی اختیار کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے ورنہ وہ پُر امن زندگی نہیں گذار سکتا اور نہ اپنے مقصد زندگی کو حاصل کر سکتا ہے۔ اسی بناء پر پستالوزی کہا کرتا تھا کہ غریبوں کو غربت ہی کی تعلیم دینی چاہئے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ غریبوں

کی مادی ضروریات کو پورا نہیں کرنا چاہتا تھا، اس کے لئے تو اس نے عمر بھر جدو جہد کی۔ البتہ وہ اس کا ضرور قائل تھا کہ غریبوں کے لئے جو پیشے موجود ہیں انھیں کے ذریعے اُن کو اپنی مادی ضروریات پوری کرنی چاہئے۔ اس طرح غریبوں کی معاشی ضروریات اطمینان سے پوری ہوجائیں گی۔ اور وہ پرامن زندگی کی برکت سے اپنی ذہنی، اخلاقی اور روحانی ترقی کی طرف متوجہ ہوسکیں گے۔ انسان کو اپنے ماحول سے دفعتاً علٰحدہ کر دینے سے نفس انسانی اور جماعتی زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور انسان کے اخلاق اور جماعتی تعلقات میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔ ہندوؤں کا ذات پات کا نظام بھی اسی اصول پر مبنی ہے۔ منو نے ہندوؤں کو چار طبقوں میں اس لئے تقسیم کر دیا تھا کہ وہ اپنے اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دیں۔ ممکن ہو کہ یہ نظام انسانی زندگی کے آغاز میں جبکہ تمدنی زندگی سادہ ہوتی ہے، مضر ثابت نہ ہو، لیکن جب ذات پات کا تشدد ایک مذہبی صورت اختیار کرلے تو اس کا جو نتیجہ ہوتا ہے، وہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہزاروں برس سے ہندوستان کی چھ کروڑ مخلوق غلامی کی بدترین زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہے جس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے، پھر اور طبقوں کے درمیان جو دیواریں قائم کر دی گئی ہیں، اُن کی وجہ سے جماعتی جمہوری زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے، اور ایک صحیح قومیت کی نشو و نما ناممکن ہوجاتی ہے۔

پستالوزی نے منو کی طرح اپنے خیالات کو اس قدر مذہبی رنگ نہیں دیا۔ لیکن اس کی نظر انسان کے نفسی اختلافات پر ضرور تھی۔ جس طرح مختلف پودے مختلف ماحول ہی میں نشو و نما پاسکتے ہیں، اسی طرح وہ مختلف خاندانوں کے لئے مختلف پیشوں کا اختیار کرنا اور ان کا اسی ماحول میں زندگی گذارنا ضروری خیال کرتا تھا۔ اسی بنا پر وہ خاندانی تعلیم کا بہت حامی تھا، اور اس کو سب سے زیادہ اعلیٰ تعلیم قرار دیتا تھا، چوں کہ یہ انسان کو اس کی بنیادوں سے قریب تر رکھتی ہے۔ بقول خود وہ "گھوڑے اور گدھے" "گلاب اور سوسن" کے فرق کو مٹانا نہیں چاہتا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ منشائے فطرت یہی ہے کہ ہر چیز اپنی اصل کے مطابق نشو و نما پائے، اس کی وجہ سے انسانیت کے نصب العین سے دست کشی لازم نہیں آتی، انسان کا اپنے نفس قوی کے مطابق اپنے اجتماعی

ماحول میں ترقی کرنا ہی انسانیت کی تکمیل ہے۔

فرانسیسی اور جرمن مساوات اور آزادی کے تخیل میں بہت بڑا فرق ہے، فرانسیسی تصور کے زیر اثر انگریزی اور امریکی تصور بھی مرتب ہوا ہے۔ اس میں حقوقِ انسانی اور انسان کے تمام معاملات میں مساوات پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ تصور تمام انسانوں کو ہموار کرکے ایک سطح پر لاکر کھڑا کردینا چاہتا ہے، اسی تصور پر انقلابِ فرانس کا نعرۂ جنگ "آزادی، مساوات اور اخوت" مبنی ہے۔ بخلاف اس کے جرمن تصور میں نفسیاتی اختلافات سے چشم پوشی نہیں کی جاتی۔ بلکہ انسان اور اقوام کا اپنے نفسی خواص کے مطابق ترقی کرنا ہی انسانیت کے اعلیٰ ترین مطمح نظر تصور کیا جاتا ہے۔

پستالوزی جب غریب کسان یا مزدوروں کے بچوں کی خدمت کرتا تھا تو اس کے پیش نظر مارکس اور لینن کی طرح ایک علٰحدہ مزدور جماعت کا قیام نہیں تھا، وہ اشتراکیوں کی طرح جماعت کو سرمایہ داروں اور مزدوروں کے دو علٰحدہ طبقوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہتا تھا، اور نہ اس کا یہ خیال تھا کہ ان میں ازل سے یہ جنگ چلی آرہی ہے، وہ جماعت میں فرقہ وارانہ احساس کا سخت مخالف تھا، پستالوزی غریب بچوں کی تعلیم صرف اس لئے کرنا چاہتا تھا کہ اس کے خیال میں وہ جماعت کے خراب اثرات سے سب سے کم متاثر ہوتے ہیں اور جلد سے جلد صحیح انسان بنائے جاسکتے ہیں، غریبوں میں تعلیم نہ ہونے کے باعث پستالوزی امیروں اور غریبوں میں بہت بڑا فرق دیکھتا تھا۔ اس خلیج کے وسیع ہونے میں وہ تمدن کے استحکام کے لئے خطرہ محسوس کرتا تھا، چنانچہ وہ اس کو تعلیم کے ذریعے کم کرنا چاہتا تھا۔ پستالوزی فطرتاً مطلق انقلاب پسند نہ تھا۔ لیکن اگر کسی چیز نے اس کو انقلاب پسند بنا دیا تو وہ غریبوں کی تباہی اور خستہ حالی تھی۔

۷۔ گوئٹے اور پستالوزی

لمحاتِ شام کے آخر میں پستالوزی نے گوئٹے پر تنقید کی ہے، اس کے نزدیک گوئٹے علم کی ان بلندیوں پر رہتا ہے جہاں ہر شخص نہیں پہنچ سکتا۔ وہ ایک رئیس ہے جو اپنی ذہنی عیاشیوں

میں جمہور کی ضروریات اور اُن کے جذبات سے ناواقف ہے۔ گوئٹے کی غیر معمولی عظمت ہمیشہ لوگوں کے پیش نظر رہتی تھی۔ اور پستالوزی کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرتی تھی پستالوزی تو عام لوگوں کو چھوٹے چھوٹے پیشوں کے ذریعے اس قابل بنانا چاہتا تھا کہ وہ معاشی بےفکری کے ساتھ ذہنی اور روحانی ترقی کریں، لیکن لوگ ہمیشہ گوئٹے کی مثال پیش نظر رکھتے ہیں، وہ ان بلندیوں تک تو پہنچ نہیں سکتے اور اپنے پیشے سے غافل ہو جاتے ہیں، جہاں ان کو اپنے فرائض کی ادائیگی کا بہترین موقع حاصل ہو۔

گوئٹے سے اس کا اختلاف ذاتیات پر مبنی نہ تھا۔ پستالوزی بہت ارفع اور اعلیٰ انسان تھا، وہ دراصل اشراقیت کے اس نصب العین کا مخالف تھا جس کا سب سے بڑا علم بردار گوئٹے تھا۔ گوئٹے میں یونان کی روح کام کر رہی تھی، جہاں غیر معمولی قوت والے لوگوں کی پرستش کی جاتی تھی پستالوزی عیسائیت کی روح کا علم بردار تھا جو غریبوں اور مفلسوں کی خدمت کرنا چاہتی ہے گوئٹے کے تمدنی نصب العین میں علم و جمال کو بھی کافی اہمیت حاصل تھی۔ بخلاف اس کے پستالوزی سوائے محبت کے دوسری تمام چیزوں سے قطع نظر کرنا چاہتا تھا۔

جدید ہندوستان میں گوئٹے اور پستالوزی کے اس اختلاف کی مثال ٹیگور اور گاندھی کے اختلاف میں نظر آتی ہے۔ ٹیگور علم اور شاعری کی بلند فضاؤں میں پرواز کرتا ہے، جہاں اُسے حقیقت کے جلوے دکھائی دیتے ہیں، گاندھی اسی حقیقت کو مظلوم ہریجنوں کے جھونپڑوں میں تلاش کرتا ہے۔ ٹیگور کے پیش نظر مشرق و مغرب کے علوم و فنون کی تحصیل ہے، تو گاندھی اخلاقی تعلیم کے سامنے تمام ذہنی تعلیم کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا۔

۸۔ نفسیات جماعت

لین ہارڈ اور گرٹرود پستالوزی کا وہ مشہور ترین قصہ ہے جس کے باعث وہ بحیثیت مصنف بہت مشہور ہو گیا۔ اس قصے میں پستالوزی نے جماعت اور تعلیم کے متعلق اپنے خیالات کا

اظہار کیا ہے۔ اور جماعت کے نفسی عوامل سے بحث کی ہے۔

لین ہارڈ اور گرٹروڈ کے سمجھنے کے لئے انسانیت کا تصور پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ پستالوزی کے عہد میں عام طور پر یہ فیشن تھا کہ انسانیت کے متعلق گفتگو کی جائے۔ مصنفین کے لئے یہ موضوع بہت اہم تھا۔ "لمحاتِ شام" میں پستالوزی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس عہد کی ذہنی میراث تھی، لیکن اس قصے میں پستالوزی نے اپنے زمانے کے خیالات سے آزاد ہو کر مسائل کے متعلق خود اپنے ذاتی خیالات پیش کئے ہیں۔

انگریزوں کی زندگی کی تاریخی اور تمدّنی بُنیادیں

(۱)

جغرافیہ کی قدیم ترین کتابوں میں بھی ایک جزیرے کا ذکر ہے جو کرۂ ارض کے شمالی مغربی کونے میں واقع ہے اور برطانیہ کہلاتا ہے۔ پُرانے زمانے کے فینقی کارنوال کی کانوں سے رانگا لایا کرتے تھے۔ مارسیلز کا جغرافیہ داں پائی تھیاس اپنی سیاحت کے سلسلے میں برطانیہ پہنچا تھا۔ جولیس سیزر کچھ دن تک انگلستان کے جنوبی ساحل پر قابض رہا تھا۔ روما کے سپہ سالار اگریکولا نے قیصر کلاڈیس کے حکم سے پورے جزیرے کو اسکاٹی کوہستان تک فتح کر کے رومی نوآبادی بنا لیا تھا۔

یہاں کے اصلی باشندوں کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہے۔ بعض محققوں کی رائے ہے کہ گول سر اور سیاہ بالوں والے لوگ جو زیادہ تر ویلس اور آئرستان میں پائے جاتے ہیں ان قدیم باشندوں کی نسل سے ہیں اور ان کا سلسلۂ نسب بحر روم کے سواحل کے اصلی باشندوں سے ملتا ہے۔ بعض کے نزدیک عجیب و غریب پکٹ قوم جو رومیوں کے زمانے میں شمالی مشرقی اسکاٹستان میں رہتی تھی اور جس میں جسم پر نقش و نگار بنانے اور کھودنے اور مادری وراثت کا رواج تھا یہاں کے اصلی باشندوں کی یادگار تھی۔ تاریخی عہد کے آغاز میں یہاں کیلٹ قوم رہنے لگی تھی۔ ویلس میں اور جنوبی مغربی انگلستان میں کیمریوں کی آبادی تھی اور بقیہ برطانیہ اور آئرستان میں کیل قبائل رہتے تھے۔ یہ لوگ ذہین، نفاست پسند، اور زود آموز تھے مگر ان کی سیاسی زندگی وحدت قبائل سے آگے نہیں بڑھی تھی اور اقتصادی زندگی بھی گاؤں اور قبیلے کی نیم اشتراکی عصبیت تک محدود تھی رومیوں نے انھیں نہایت آسانی سے مغلوب کر لیا۔ فاتح قوم نے تمام ملک کو ایک فوجی چھاؤنی بنا دیا جس میں اعلیٰ درجے کی سڑکوں کا جال بچھا تھا ان میں سے بعض آج تک شاہراہوں اور ریل کی لائنوں

کی شکل میں موجود ہیں۔) جابجا فوجی پڑاؤ تھے اور بعض شہروں میں حکومت خود اختیاری قائم تھی۔ چنانچہ چیسٹر، لنکاسٹر، لنکن وغیرہ کے ناموں میں رومی الفاظ کاسٹرا (CASTRA) اور کولونیا (COLONIA) اب تک موجود ہیں، ان شہروں میں ایک قلیل التعداد اعلیٰ طبقہ لاطینی زبان بولتا تھا، رومی طرز کی عمارتیں بناتا تھا، اوسط درجے کی رومی عیش و عشرت کا لطف اٹھاتا تھا اور اُن دیوتاؤں کو پوجتا تھا جو بحر روم کے آس پاس پوجے جاتے تھے مگر عام ملک پر رومیت کا ویسا گہرا اثر نہ تھا جیسا فرانس اور اسپین میں، چنانچہ برطانیہ میں کوئی ایسی زبان نہیں بولی جاتی جو لاطینی سے نکلی ہو۔

جب رومی فوجوں کو اپنے ملک واپس جانے کی ضرورت پڑی تو برطانیہ پر جرمن قبائل کی یورش ہوئی۔ پہلے تو دریائے ایلب اور دریائے ویسر کے دہانے سے (غالبًا نارمنڈی کے نو مفتوحہ علاقوں سے) سکسن قوم بڑھی اور آبنائے انگلستان کو عبور کر کے آہستہ آہستہ دریائے ٹیمس کے کنارے تک کل ملک پر قابض ہوگئی (کم و بیش ۵۰۰ء میں) دو قرن کے بعد اینگل قوم شلیوگ ہولسٹائن اور دریائے ایلب کے نشیبی حصوں سے چل کر کیلٹ اقوام سے لڑتی بھڑتی دریائے ٹیمس اور فرتھ آف فورتھ کے درمیان مشرقی جانب دو ثلث حصے کی مالک ہوگئی۔ اس نے بہت سی حکومتیں قائم کیں جن کے حدود اور نام آج تک بعض قسمتوں اور کلیسائی اضلاع میں بدستور باقی ہیں مثلاً ویسکس، سسکس، ایسکس۔ اس کے علاوہ کینٹ اور ہیمپشائر میں جوٹ قوم نے ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اینگل قوم کا مشرقی راج (نارفاک اور سفاک) میں تھا۔ ان لوگوں نے کیلٹ، مرسی اور نارتھمبر اقوام کو مغلوب کر کے دریائے ہمبر کے دہانے سے فرتھ آف فورتھ تک اپنی سلطنت مستحکم کر لی اور اسکاٹستان کے کل نشیبی خطے کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ شارل اعظم کے زمانے میں برطانیہ کے کل جرمن مقبوضات متحد ہو کر ویسکس کے بادشاہ ایگبرٹ کے زیر فرمان تھے۔

تمام مؤرخ ابتدا ہی سے جرمن فاتحوں کے وحشیانہ ظلم کی شکایت کرتے آئے ہیں پھر

بھی یہ بعید از قیاس ہے کہ لوگوں نے کیلٹ قوم کو بالکل نیست و نابود کر دیا ہو۔ شمال مغرب (کمبرلینڈ) اور جنوب مغرب (کارنوال) میں کچھ دن پہلے تک کیلٹی زبان بولی جاتی تھی۔ بہت سے شہروں (مین زنیس، لیسٹر، کارلیل، لندن، ڈینبار) اور دریاؤں (ایون، سیورن، ٹیمس، ٹرینٹ ڈی) کے نام یقیناً کیلٹی زبان کے الفاظ سے مشتق ہیں۔ موجودہ زمانے میں انگلستان میں کیلٹی شکل و شمائل کے لوگ اس کثرت سے نظر آتے ہیں، کہ یہ توجیہہ کہ وہ سب قریب کے ملکوں سے آگئے ہیں کام نہیں دیتی۔ پھر جو شخص تاریخ ادبیات کا مطالعہ کرتا ہے اُسے انگریزی ادب میں تخیل کا قوی عنصر بھی جرمن انداز طبیعت کے خلاف نظر آتا ہے جس کی مثال میں شکسپیر، اسپنسر شیلے اور کیٹس کا نام لینا کافی ہے اسی طرح انگلستان کے ادنیٰ طبقوں کی اشتعال پذیری سے بھی غیر جرمن عنصر کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب تک یہ لوگ خوش حال ہوں ان میں کسی قسم کی حرکت پیدا کرنا مشکل ہے لیکن جہاں کسی خطرہ کا شور اٹھا (مثلاً سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں پوپ کا اندیشہ، انیسویں صدی میں فرانس کے اور بیسویں صدی میں جرمنی کے حملہ کا خوف) تو یہ خود بخود بھڑک اٹھتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح کی غیر معین علامات کی بنا پر قوموں میں نسلی امتیاز کرنے میں غلطی کا احتمال ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انگریز قوم کی رگوں میں جرمن خون کے ساتھ کیلٹی خون بھی ملا ہوا ہے۔ کیلٹی زبان ویلس، اسکاٹستان اور آئرستان میں اب تک بولی جاتی ہے۔ ویلس میں تو یہ ایک ملکی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رو سے ویلس اور اس سے ملی ہوئی انگلستان کی قسمت مان متھ میں ۵۲ فیصدی باشندے کیلٹی زبان بولتے ہیں اور دو قسموں میں تو نصف سے زیادہ لوگ سوائے اس کے کوئی زبان نہیں جانتے۔ اسکاٹستان کی شمالی قسمتوں (آرگائل، انورنیس، روس کرومارٹی اور سدرلینڈ) میں ۴ فیصدی باشندے محض گیلی زبان اور ۲۲ سے ۵۰ فیصدی تک گیلی اور انگریزی دونوں بولتے ہیں۔ آئرستان میں انگریزوں کے جبر و تشدد سے محض آئری زبان بولنے والوں کی تعداد گھٹ کر ½ فیصدی رہ گئی ہے یعنی سوائے دو صوبوں ڈونگل (۲٫۸) اور گیلوئے (۲٫۴) کے اور

کہیں یہ لوگ کسی شمار ہی میں نہیں۔ البتہ پچھلے قرن کی زوردار قومی تحریک کے سلسلے میں سارے ملک میں آئرِی زبان پھیلانے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۲ء میں (۹ ر ۱۲) فیصدی باشندے انگریزی کے ساتھ آئرِی زبان بھی بولتے تھے۔

انگلستان میں عیسوی مذہب بہت جلد پہنچ گیا۔ پہلی بار آئرستان کی راہ سے آیا جہاں اُسے مقدس پیٹرک کے عہد سے اب تک زوال نہ ہوا تھا۔ یہ مذہب کیلٹی اثرات قبول کر کے بہت کچھ بدل گیا تھا۔ قوم پرستی، پوپ کے اثر سے آزادی، رہبانیت، خانقاہ کی زندگی اس کی خصوصیات تھیں۔ اس کا مرکز جزائر ہیبرڈیز کا ایک دور دراز جزیرہ جونا تھا۔ اس کے کچھ دن بعد (۵۹۵ء میں) روما کے مبلغ جنوبی برطانیہ میں پوپ کی عیسائیت لے کر پہنچے۔ شدید نزاعوں کے بعد ہی رومی عیسائیت غالب آئی یعنی عالمگیر کلیسا کی تحریک کو تنگ نظرانہ قوم پرستی پر (اگرچہ انگلستان کی عیسائیت میں ہمیشہ قومیت کا ایک قومی عنصر موجود رہا ہے) اور علمی اثبات زندگی کے تمدن کو خانقاہ کی باطنیت اور رہبانیت پر فتح حاصل ہوئی۔

نوجوان جرمن عیسائی تمدن کے لئے ناروے اور سویڈن کی ملحد قوموں (جنھیں انگلوسکسن لوگ ڈین کہتے تھے) کے حملے بہت خطرناک تھے۔ انھوں نے عرصے تک اسکاٹستان کے قریب کے جزائر پر اور جزیرہ مین پر حکومت کی اور آئرستان میں کئی سلطنتوں کی بنیاد ڈالی چنانچہ آئرستان کے مشہور شہر ڈبلن (۸۴۰ء) اور کارک (۸۶۰ء) عیسوی انھیں لوگوں کے بسائے ہوئے ہیں۔ انگلستان میں یہ لوگ سالہا سال قتل و غارت کرتے رہے شاہ الفرڈ (۸۷۱ء تا ۹۰۱ء) نے اپنے ملک کو اس شدید خطرے سے نجات دی "ڈین" لوگوں نے مذہب عیسوی اور انگلوسکسن بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی لیکن الفرڈ کو ان کے لئے اپنے ملک کا پورا مشرقی حصہ خالی کرنا پڑا جس میں انھوں نے اپنی بستیاں بسائیں۔ بعض شہروں مثلاً ڈربی، وہٹبی وغیرہ کے ناموں میں ڈینی زبان کا لفظ "بی"، جو شہر کے معنی رکھتا ہے۔ اور یوں بھی انگریزی زبان کے موجودہ ذخیرۂ الفاظ کا ایک معقول حصہ اسکینڈی نیوین زبان سے ماخوذ ہے۔ یہاں تک کہ روزمرہ کی گفتگو

میں بھی ان زبانوں کی ضمیریں THEY ، THEIR وغیرہ داخل ہوگئی ہیں۔ الفریڈ کی موت کے بعد جنگ نئے سرے سے چھڑ گئی کینوٹ اعظم (سال وفات ۱۰۳۵ء) جو اسکینڈی نیویا کا بادشاہ تھا انگلستان پر بھی حکومت کرتا تھا۔ اُس کے بعد ایڈورڈ کنفیسر کے تخت نشین ہونے سے حکومت ایک ہم قوم خاندان میں واپس آگئی لیکن اسی زمانے سے زوال کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ خود بادشاہ پر نارمن قوم کے خیالات کا بہت اثر تھا اور اُس کے ہم قوموں یعنی انگلوسکیس لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے یہ اندیشہ تھا کہ اُس کی سلطنت دوبارہ ان حکومتوں میں بٹ جائے گی جنھیں ایگبرٹ اور الفریڈ اعظم نے متحد کیا تھا۔ ۱۰۶۶ء میں ہرالڈ کے عہد حکومت میں ولیم فاتح نے انگلوسکسن سلطنت کو مسخر کرلیا۔

(۲)

نئے خاندان شاہی کے ہاتھ میں زمام حکومت کا آنا تھا کہ فرانسیسی تمدن کی ایک زوردار لہر تمام ملک میں دوڑ گئی جس سے ابتدا میں یہ اندیشہ تھا کہ انگلوسکیس تہذیب بالکل فنا ہو جائے گی۔ یہ خطرہ اِس سبب سے اور بڑھ گیا کہ قدیم الایام سے برطانیہ اور فرانس میں بہت گہرے تعلقات چلے آتے تھے (چنانچہ جولیس سیزر نے بھی اس کا ذکر کیا ہے) اور انگلوسکیس عہد میں برابر فرانسیسی تمدنی عناصر انگلستان میں داخل ہوتے رہے تھے، فرانس ہی کے توسط سے انگلستان نے ہمیشہ براعظم کے تمدن سے تعلق قائم رکھا ہے۔ کینٹ کی ایک ملکہ نے جو فرانکی نسل سے تھی (۵۹۷ء) انگلوسکیس قوم میں عیسائی مذہب کی اشاعت میں بہت مدد دی تھی، شاہ ایگبرٹ جس نے انگلوسکسن لوگوں کو متحد کیا عرصے تک فرانس میں رہا تھا، قدیم انگلستان کے سب سے اولوالعزم بادشاہ الفریڈ اعظم کی سوتیلی ماں فرانس کے بادشاہ شارل[۵] اصلع کی ماں تھی۔ فن تعمیر اور نقاشی میں انگلوسکیس تمدن پر فرانسیسی اثر اور ایک حد تک فرانسیسی تمدن پر انگلوسکسن اثر صاف نظر آتا ہے خود انگلوسکسن

---

[۵] CHARLES THE BALD

عہد کے آخر میں منصبداری نظام اور فوج کی بہت سی اصطلاحات انگریزی میں داخل ہوچکی تھیں ، ایڈورڈ کنفیسر، نے جو اصل میں انگلوسیکسن نسل کا آخری بادشاہ تھا، اپنا دربار بالکل نارمن طرز پر قائم کیا تھا۔ اب نئے فرانسیسی خاندان کی حکومت سے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا کہ جرمن طرز معاشرت بالکل فنا ہوجائے گا۔

نئے خاندان نے جفاکش انگلوسیکسن قوم کی مقاومت کو ایک سخت گیرانہ نظام منصبداری کے ذریعے سے جو ایک مرکزی قوت کے ماتحت تھا جس میں جرمن طرز کی خود مختار حکومتوں کی مطلق گنجائش نہ تھی اور نارمن امرا، نارمن اسقفون اور فرانسیسی تہذیب کی مدد سے دبالیا۔ رچارڈ شیر دل جو سب سے بڑا تو نہیں مگر سب سے مشہور بادشاہ تھا بالکل ایک رنگیلا فرانسیسی تھا، کہیں چودھویں صدی میں جاکر بادشاہ پر انگریزی رنگ چڑھا اور عدالتوں اور پارلیمنٹ میں انگریزی زبان جاری ہوئی۔ (مگر قدیم سرکاری فرانسیسی زبان کا اتنا اثر باقی رہا کہ بادشاہ نئے قوانین کو اس جملے سے منظور کرتا ہے (LEROILE VUELT) اور کسی جلیل القدر حاکم یا جج کی آمد کا اعلان (OYEZ) کے لفظ سے کیا جاتا ہے) فرانس میں نارمن راج کے مقبوضات پر اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے پلانٹیجینٹ خاندان کے بادشاہ ایڈورڈ سوم (۱۳۲۷ء تا ۱۳۷۷ء) اور ہنری پنجم نہایت ثابت قدمی سے لڑتے رہے بلکہ انھوں نے سارے فرانس کو فتح کرنے کی کوشش کی، مگر اُن کی ساری سعی لاحاصل ثابت ہوئی یہاں تک کہ ۱۵۵۹ء میں انھیں کیلے سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ انگلستان کی سلطنت براعظم سے بالکل الگ ہوئی۔ ۱۶۵۸ء میں ڈنکرک انگریزوں کے قبضے میں آیا مگر چار ہی سال بعد پھر نکل گیا جس سے دوبارہ رشتۂ تعلق قائم ہونے کے امید بالکل جاتی رہی۔

انگلوسیکسن لوگوں نے نہایت عزم واستقلال سے اپنے تمدن کو غیر ملکی عنصر کے غلبے سے بچایا یہاں تک کہ آخر خود فاتح قوم کو اپنے اندر جذب کرلیا۔ یہ سچ ہے کہ اُن کی زبان میں فرانسیسی الفاظ کی بھرمار ہوگئی مگر سب سے اہم چیز یعنی صرفی اور نحوی ترکیب خالص جرمن ہی رہی۔ طرز حکومت اور ملکی نظم ونسق پہلے بالکل نارمن طرز کا تھا لیکن آگے چل کر انگلوسیکسن عنصر غالب آگیا طرز

تعمیر بھی ابتدا میں فرانسیسی تھا لیکن قرون وسطےٰ کے آخر میں انگلستان میں ایک جزائری طرزِ عمارت کی نشو ونما ہوئی جس کی مثال براعظم میں کہیں نہیں ملتی۔ نارمن امرا کی نسل بھی رفتہ رفتہ منقطع ہوگئی (اگرچہ نسب ناموں میں اُسے چھپانے کی کوشش کی گئی ہے) اور ان کی جگہ قرون وسطیٰ کے آخر میں نوخیز انگلوسیکسن خاندانوں نے لے لی۔ قرون وسطےٰ کی تمدنی تحریکوں سے شمالی جرمن اور انگلوسیکسن الگ تھلگ رہے۔ اس عہد کی عاشقانہ شاعری کا اثر انگلستان میں بہت خفیف تھا اور صلیبی جنگوں کا اس سے بھی کم۔ قیصری نظامِ حکومت تمام عیسائی ممالک میں پھیل چکا تھا مگر انگلستان والے نہ اس کے اخلاقی پہلو کو سمجھتے تھے اور نہ اُس سے دلچسپی رکھتے تھے۔ بادشاہ اور پوپ کی جنگ میں اکثر انگلستان کے بادشاہوں نے بھی حصہ لیا ہے خصوصاً ہنری دوم کے عہد میں جو قیصر باربروسا کا ہمعصر تھا اس نزاع نے اتنا طول کھینچا کہ اسقفِ اعظم ٹامس بیکٹ کلیسا پر قربان ہوگیا لیکن قوم کو اس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ پوپ انوسینس سوم نے شاہ جان (۱۱۹۹ء تا ۱۲۱۶ء) کے عہد کی نازک سیاسی حالت سے فائدہ اٹھا کر انگلستان کو اپنا باجگذار بنا لیا تھا لیکن ایک ہی صدی کے اندر بادشاہ کی قوت پھر بڑھ گئی اور جب اس عہد کے پوپ نے پرانے مطالبات نئے سرے سے پیش کرنا چاہے تو انگلستان نے وکلف کی قیادت میں روما کی حکومت کے خلاف گہرے قومی جوش کا اظہار کیا۔ اس زمانے میں انگلوسیکسن نارمن، اور بچے کھچے کیلٹ لوگ مل جل کر ایک متحدہ قوم بن چکے تھے۔ غالب عنصر شمالی جرمن کسانوں کی نسلی خصوصیات کا ہے: مادیت پرستی آداب ورسوم سے بے پروا ہونا کھرا پن آزادی کا غرور مضبوطی جفاکشی، جرمن باطنیت مگر اُسی کے ساتھ پروازِ تخیل، اور ہنگامی اشتعال پذیری جس میں کیلٹی سیرت کی جھلک نظر آتی ہے، اندر تو یہ کیفیت ہے اور باہر سے ظاہری تہذیب کی ایک موٹی تہ جم گئی ہے جو زیادہ تر نارمن قوم کی ارث ہے، نارمن آبا و اجداد ہی سے انگریزوں کو حکمت عملی اور لوگوں سے کام نکالنے کا مادہ ملا ہے جو صرف اعلیٰ طبقے میں پایا جاتا ہے اور معمولی لوگوں میں مفقود ہے، نارمنوں ہی سے انھیں حسنِ صورت کا ذوق حاصل ہوا ہے جو اُن کے مذہب (دیکھئے آکسفورڈ کی مذہبی تحریک اور "ہائی چرچ" کا نظام) اور ان کی شاعری کر ملاحظہ ہو چارلس دوم کے زمانے کے شعرا اور پوپ اور ڈرائیڈن

کا کلام) میں جرمنوں کی اجڈ طبیعت اور خشک باطنیت سے دست و گریبان نظر آتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے آخر میں ان مختلف عناصر کے ملنے سے ایک ہمرنگ، مغرور، بدیسی تہذیب کو حقیر سمجھنے والی قوم بن گئی تھی۔ اس زمانے میں جو غیر ملک کے لوگ انگلستان آئے تھے انھوں نے انگریزوں کے غرور اور خود پسندی کا ذکر کیا ہے۔

نارمن سلطنت ابتدا میں خالص مستبدانہ اور منصبداری کے نظام پر مبنی تھی۔ وہ اتنی قوی تھی کہ اُس نے چھوٹی حکومتوں کو ابھرنے نہ دیا ورنہ جرمنی کی طرح یہاں بھی بادشاہ شاہِ شطرنج بن کر رہ جاتا۔ یہاں تمام ملک میں شاہی عدالتیں قائم تھیں اور بادشاہ کی طرف سے محصول وصول کیا جاتا تھا۔ نظام منصبداری میں زمین کا اصلی مالک بادشاہ تھا نہ کہ اُس کے ماتحت امرا اور کلیسا کے مقابلے میں بھی بادشاہ ہی تمام سلطنت کی نمائندگی کرتا تھا۔ امرا کو آپس میں جنگ کرنے کا حق نہ تھا۔ صرف سرحدی علاقوں میں یعنی ویلس اور اسکاٹستان کی سرحد پر بعض ارل اور کاؤنٹ (نارومبرلینڈ لنکاسٹر، چیسٹر، شریوسبری، ہرفرڈ اور ڈرہم کا اسقف) کبھی کبھی بادشاہ کے مقابلے میں خود مختاری کا دعویٰ کرتے تھے مگر وہ بھی اسے بنہا نہیں سکتے تھے۔ اُس زمانے کی اتنی یادگار اب تک باقی ہے کہ صوبہ لنکاسٹر کے چانسلر کے نام سے ایک عہدے دار ہوتا ہے جو مجلس وزرا میں شریک کیا جاتا ہے اگرچہ اُس کے ماتحت کوئی خاص صیغہ نہیں ہوتا۔ البتہ ویلس میں جسے ایڈورڈ اول نے ۱۲۸۲ء میں فتح کیا تھا ہنری ہشتم کے زمانے تک واقعی خود مختاری حکومت تھی۔ اس انتہائی مرکزیت کے نتائج ظاہر ہیں۔ اس کی بدولت انگلستان بیرونی ممالک کے مقابلے میں ہمیشہ قوی اور مستعد پیکار رہا ہے اور خود اس کے اندر کبھی قبائلی امتیازات کا ایسا خیال پیدا نہیں ہونے پایا جو قابلِ ذکر ہو۔ مگر دوسری طرف اس نظام نے ساری قوم میں ایسی یک رنگی پیدا کر دی جو جرمن قبائل کی زندگی کی گوناگونی کے مقابلے میں ایک طرح کا نقص معلوم ہوتی ہے۔ تعلیم یافتہ انگریزوں کی زبان میں روزمرے اور محاورے کا وہ لطف نہیں جو اسکاتوں اور امریکیوں بلکہ اکثر تعلیم یافتہ جرمنوں کی گفتگو میں پایا جاتا ہے۔ قومی سیرت کی مقامی خصوصیات، مقامی رسم و رواج، اپنے

اپنے دیس سے تعلق خاطر، یہ باتیں انگریزوں میں بھی ہیں لیکن جرمنوں سے بہت کم۔ جرمنی میں قبائلی خصوصیات کے سبب سے جو رنگا رنگی پیدا ہوگئی ہے اُس کے خلاف انگریزوں کے طرزِ معاشرت میں (یہاں اسکاٹستان والوں کا ذکر نہیں) ایسی یکسانی نظر آتی ہے جس کے سبب سے اُن کے یہاں بڑے شہروں میں ایک بے رنگ اور آفاقی آبادی کے اکٹھا ہوجانے میں خطرناک حد تک مدد ملتی ہے۔ مگر باوجود شاہی استبداد کے نارمنوں کے زمانے میں بھی اینگلو سیکسن قوم کا حکومت خود اختیاری کا رجحان بدستور باقی رہا اور بادشاہ، منصبدار امرا اور کلیسا کی باہمی نزاعوں کے سبب سے چھوٹے چھوٹے رئیسوں اور قصبوں کو بہت جلد خاصی اہمیت حاصل ہوگئی۔ ۱۲۱۵ء میں جو منشور آزادی شاہ جان سے حاصل کیا گیا تھا اُس کی اہمیت میں مورخین ایک عرصے تک مبالغہ کرتے رہے لیکن اُس میں شبہ نہیں کہ اُس کی بدولت چھوٹے رئیس اور قصبے ایک حد تک بادشاہ کے استبداد سے محفوظ ہوگئے۔ اس کے پچاس ہی برس بعد (۱۲۶۵ء میں) چھوٹے رئیسوں نے یہ کوشش کی کہ قصبوں کے نمائندوں سے مل کر حکومت کے خلاف ایک مضبوط پارٹی بنائیں۔ چودھویں صدی کے آغاز میں موجودہ پارلیمنٹ یعنی ملک کے تینوں طبقوں منصبدار امرا، پادریوں اور عوام الناس (اصل میں زمینداروں اور قصبوں کے نمائندوں) کی آئین ساز جماعت کی بنیاد پڑی۔ ملک کے نمائندوں کی اس جماعت کو رفتہ رفتہ یہ حق حاصل ہوگیا کہ ہر قسم کا محصول لگانے کی منظوری دے اور بادشاہ کے جو مشیر ملک میں ہردلعزیز نہ ہوں اُن کی بدعملیوں کو روکنے اور اُن کے برخاست کرنے کا مطالبہ کرے۔ وہ بتدریج سلطنت کی سب سے اونچی قوت بن گئی یہاں تک کہ اُس نے دوبارہ بادشاہ وقت (۱۳۲۷ء میں ایڈورڈ دوم اور ۱۳۹۹ء میں رچارڈ دوم) کو معزول کردیا۔ ٹیوڈر بادشاہوں کے عہد سے (ہنری ہفتم کے زمانے سے جس نے ۱۴۸۵ء سے ۱۵۰۹ء تک حکومت کی۔ پارلیمنٹ کا اقتدار کم ہوگیا مگر چارلس اول کے زمانے میں اُس نے کرامویل کی قیادت میں بادشاہ کو شکست دے کر کھوئی ہوئی قوت پھر حاصل کرلی اور ایک نئے انقلاب (یعنی ۱۶۸۸ء میں جیمس دوم کے اخراج) کے بعد تو اُس نے بادشاہ کے اثر کو اتنا کم کردیا

کہ وہ شاہ شطرنج بن کر رہ گیا۔

(۳)

تجدید مذہب کی تحریک میں انگلستان نے بہت کافی عملی حصہ لیا۔ اس تجدید کا سیاسی پہلو یعنی منفرد اقوام کا پوپ کے سیاسی مطالبات کی مخالفت کرنا اور اس کا مذہبی پہلو یعنی استحالہ عشائے[1] ربانی کے مسئلے اور مذہبی پیشوائی اور کلیسائی اقتدار کے معاملے میں شبہات پیدا ہونا دونوں پہلے پہل انگلستان میں جان وکلف (سال وفات ۱۳۸۴ء) کی بدولت منظر عام پر آئے۔ لیکن نئی تحریک کے آغاز ہی میں ہمیں انگریزوں کی مذہبیت کا مخصوص رنگ صاف نظر آتا ہے، اُن کی ایک معقول اقلیت، یعنی پندرھویں صدی میں لولارڈ فرقے اور سولھویں اور سترھویں میں پیوریٹن فرقے کے لئے یہ مسائل روحانی اور باطنی اہمیت رکھتے تھے لیکن عام قوم کو محض ان کے ایک پہلو یعنی تحریک آزادی سے دلچسپی تھی بلکہ لولارڈ اور پیوریٹن فرقہ بھی زیادہ زور اسی چیز پر دیتا تھا۔ وکلف کے زمانے میں انگلستان پر پوپ کا اثر بہت کم ہو گیا اور ہنری ہشتم کے زمانے میں تو روما سے رشتۂ تعلق بالکل منقطع ہو گیا۔ پروٹسٹنٹ مذہب کی انتہا پسند جماعتیں متعدد غیر مقلد فرقے (پریسبیٹرین، انڈیپنڈنٹ وغیرہ) قائم کر کے کلیسا کے اقتدار کو کمزور بلکہ معدوم کرنا چاہتی تھیں۔ جہاں تک فرد کو مذہبی تقلید سے آزاد کرنے کا سوال تھا یہ لوگ نہایت شدت، استقلال اور انتہائی ایثار کے ساتھ لڑتے تھے۔ مگر مذہب کے نظری مسائل اور عقائد کی بحث سے سوائے معدودے چند افراد کے کسی کو بحث نہ تھی۔ انگلستان کے سب سے بڑے مستبد بادشاہ ہنری ہشتم (۱۵۰۹ تا ۱۵۴۷ء) نے نئی مذہبی تحریکوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی مطلق العنانی اور تعدد ازدواج کی خواہشات پر کلیسا کے دامن تقدس کا پردہ ڈالا۔ جب پوپ نے اسے پہلی بیوی کو طلاق دینے کی اجازت نہیں دی تو اُس نے رومی کلیسا سے قطع تعلق کر لیا اور رعایا کو

---

(۱) یہ مسئلہ کہ عشائے ربانی میں روٹی اور شراب قلب ماہیت سے حضرت مسیح کا گوشت اور خون بن جاتی ہے۔

اس پر مجبور کیا کہ وہ ایک خانہ ساز مذہب اختیار کرے جس میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک عناصر ملے جلے تھے۔ اُس کے جانشین ایڈورڈ ششم نے (۱۵۴۷ء تا ۱۵۵۳ء) خالص کیلوینی مذہب کو رواج دیا اور ملکہ میری کے زمانے (۱۵۵۳ء تا ۱۵۵۸ء) کے مختصر کیتھولک دور کے بعد ایلزبتھ نے ایک ایسے مذہب کی بنیاد ڈالی جس میں عقائد تو پروٹسٹنٹ فرقے کے تھے لیکن کلیسائی مراتب اور عبادت کے طریقے کیتھولک فرقے کے؛ جمہور کی اکثریت ان سب باتوں کو چپ چاپ قبول کرتی رہی اور پیوریٹین اقلیت نے مخالفت بھی کی تو رومی عشائے ربانی اور دوسرے مابہ النزاع مسائل کی نہیں بلکہ صرف کلیسائی مراتب کی۔

آئندہ زمانے کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ انگلستان میں تجدید مذہب کی تحریک کا اثر سب طبقوں پر یکساں نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ کم سے کم اصل انگلستان اور اسکاٹلستان سے کیتھولک مذہب قریب قریب بالکل معدوم ہو گیا لیکن نیا انگلیکن قومی کلیسا محض سیاسی اور سماجی اقتدار رکھنے والے اونچے طبقوں کے لئے محدود تھا۔ نیچے طبقوں کے لوگوں کو اس سے تعلق نہ تھا، وہ عموماً ڈسینٹر یا نان کنفرمسٹ (غیر مقلد) اور سترھویں صدی میں پیوریٹین تھے یعنی بے شمار چھوٹے چھوٹے فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جو جمہوری نظام کے پابند اور انگلیکن کلیسا سے کہیں زیادہ کیتھولک مذہب کے دشمن تھے۔ انگلیکن ڈسینٹر لوگوں میں اتنا فرق نہیں ہے جتنا دوسرے ملکوں میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں ہے۔ اُن کا اختلاف اصل میں عقائد پر نہیں بلکہ سماجی مراتب پر مبنی ہے۔ ان میں باہم وہی تضاد ہے جو اونچے اور نیچے حقوق رکھنے والے اور کس مپرسی میں بسر کرنے والے طبقوں میں ہوتا ہے اور اس کے پوری طرح ظاہر نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ جو ڈسینٹر سماجی حیثیت سے ترقی کرتے ہیں وہ سرکاری کلیسا میں شامل ہو جاتے ہیں۔ عرصے تک دونوں کے تمدن اور طرز معاشرت میں بھی تضاد رہا بلکہ آج بھی موجود ہے۔ انگلیکن فرقے میں کشادہ دلی اور رواداری ہے جو سرکاری کلیسائی مذہب میں عموماً پائی جاتی ہے اس میں ہر قسم کے کلیسائی عقائد کے لئے گنجائش ہے۔ اُس جوش اور باطنیت سے جو کراشا

اور کر سچیانا روسیٹی میں تھی اُس دنیا داری اور بیجان رسوم کی پابندی تک جس کا نمائندہ اٹھارھویں صدی میں لارڈ بالنگ بروک تھا۔ چنانچہ انگلستان میں علمی اور ادبی ذوق کے حامل جن کے پیشِ نظر علاوہ مذہب کے دوسرے نصب العین بھی ہیں، صرف انگلیکن مذہب والوں میں پائے جاتے ہیں۔ بہ خلاف اس کے نان کنفرمسٹ لوگ مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوتے ہیں ان کی مذہبیت کے مختلف مدارج ہوتے ہیں بعض اُس ظاہری شریعت پرستی کے پابند ہوتے ہیں جس کا توریت میں حکم ہے اور بعض میں مشاہدے اور وجدان کی لطیف ترین باطنیت پائی جاتی ہے مگر سب کی نظر سختی کے ساتھ مذہب تک محدود ہوتی ہے۔ سب دیانت دار، بیدار مغز، رنگینی اور تخیل سے خالی فنونِ لطیفہ کے دشمن، کم ظرف اور بدمذاق ہوتے ہیں۔ ۱۶۳۰ء میں پہلے پہل یہ تضاد پوری طرح ظاہر ہوا۔ اس عہد میں تمدن کے اصلی حامل (CAVALIERS) تھے، جو ظاہری اعتبار سے سرکاری کلیسا سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ فنونِ لطیفہ کے عاشق، خوش باش، لاابالی مزاج کے تھے اور انھیں یہ دعویٰ تھا کہ آبائی ریاست اور نشاۃ ثانیہ کی تہذیب کی بدولت ہم دوسرے انسانوں سے افضل ہیں۔ اس زعم میں اپنے مرتبے کو قائم رکھنے کے لئے یہ ہر طرح کے ظلم اور بد دیانتی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ان کا مکمل نمونہ چارلس اول تھا۔ دوسری طرف پیورٹین لوگ تھے جو سب کے سب سوائے اپنے جلیل القدر شاعر ملٹن کے دیانت دار پرہیزگار فنونِ لطیفہ کے دشمن اور تنگ نظر تھے۔ ان کے مختصر عہد حکومت نے (۱۶۴۰ء یا ۱۶۴۹ء سے ۱۶۶۰ء تک) انگریزی تھیٹر اور انگریزی موسیقی کا خاتمہ کر دیا۔ بخلاف شاعری اور ناول نویسی کے جو بادشاہ وقت کی سرپرستی میں گوشۂ تنہائی میں بھی نشو و نما پا سکتی ہیں، موسیقی اور تھیٹر دونوں قبولِ عام کے محتاج ہیں، اس لئے انھیں جو صدمہ پیورٹین حکومت کے زمانے میں پہنچا تھا اس سے وہ آج تک نہیں سنبھلے ہیں۔ انگلیکن کلیسا کی فتح (۱۶۶۰ء) کے بعد ڈراما کی قدغن کا پہلا دور تو ختم ہو گیا لیکن دوسرا دور جو آج تک چلا جاتا ہے اس وقت شروع ہوا جب اٹھارھویں صدی میں انگلیکن لوگوں میں نیچے طبقوں کی روح سرایت کر گئی۔ یہ نیچے طبقے والے جب

اونچے طبقے میں شامل کرلئے گئے تو انھوں نے پیورٹین عقائد کی سختی اور کلیسا کی سیاسی مخالفت کو ترک کر دیا مگر تمدنی نصب العین کو مذہب کے تنگ دائرے میں محدود رکھنے پر ان میں سے بہت سے آج تک قائم ہیں۔

انگلستان کے بادشاہوں کی استبداد پسندی جس کے سبب سے وہ قرون وسطیٰ کے آغاز سے برابر انفرادی قوت اور انفرادی آزادی کو دبانے کی کوشش کرتے رہے آخری اسٹوارٹ بادشاہ جیمس دوم کی معزولی (۱۶۸۸ء) کے بعد ختم ہوگئی۔ اب بجائے استبدادیت کے امرا کی عدیدی حکومت قائم ہوگئی۔ بادشاہ کی قوت کو لوگ روز بروز دباتے رہے خصوصاً ۱۷۱۴ء سے جب ہنووری خاندان باہر سے کر انگلستان کے تخت سلطنت پر حکومت کرنے لگا۔ جارج سوم (۱۷۶۰ء تا ۱۸۲۰ء) کی آخری کوشش کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو عدیدیت سے آزاد کرے، بالکل ناکام رہی۔ امرا کی دو پارٹیاں ٹوری اور وھگ ۱۸۳۲ء تک باری باری سے حکومت کرتی رہیں۔ یہ امرا اور شرفا کی حکومت عہد جدید میں انگلستان کی زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے اور اس کا اثر صرف نظام سلطنت پر نہیں پڑا ہے بلکہ انگریزوں کی سیرت اور ان کی ذہنی زندگی پر آج تک یہ رنگ چھایا ہوا ہے۔

امرا سیاسی زندگی کے ہر شعبے میں سپید و سیاہ کے مالک تھے۔ مسلسل قوانین کے ذریعہ سے جو بظاہر بے ضرر نظر آتے تھے مگر اپنے اثرات کے لحاظ سے بہت دور رس تھے، عوام عملاً سیاسی قوت میں حصہ لینے سے بالکل محروم کر دیے گئے۔ ضلعوں کا مقامی انتظام مجسٹریٹوں کے ہاتھ میں تھا جو سب کے سب بڑے زمینداروں کے خاندان سے ہوتے تھے۔ شہروں میں بھی وہ سخت قیود جو اسٹوارٹ بادشاہوں نے حق انتخاب پر عائد کی تھیں بدستور باقی رہنے دی گئیں۔

شہروں کی اقتصادی زندگی بھی اُس زمانے میں جب بڑے کارخانے نہیں قائم ہوئے تھے آس پاس کے بڑے زمیندار خاندانوں کی پابند تھی۔ خود پارلیمنٹ کے انتخابات پر یہ لوگ آسانی سے اثر ڈال سکتے تھے کیونکہ حلقہ ہائے انتخاب بہت محدود اور رائے دینے

والے بہت کم ہوتے تھے۔ وہ تمام شہر جو صنعت و حرفت میں ترقی کر رہے تھے اور جن سے یہ اندیشہ تھا کہ اپنی مستقل قوت قائم کرلیں گے اور ارباب حکومت کے لئے خطرناک ثابت ہوں گے مثلاً لیڈس، بریڈفورڈ، مانچسٹر، برمنگھم، شیفلڈ، پارلیمنٹ میں اپنے جداگانہ نمائندے بھیجنے کے حق سے محروم تھے درانحالیکہ زراعتی خطوں کے چھوٹے چھوٹے حلقہ ہائے انتخاب جن میں سے بعض محض غیر آباد باغوں پر مشتمل تھے بدستور قائم رکھے گئے کیونکہ وہ بڑے زمینداروں کے پشت پناہ تھے ملکی نظم و نسق کی تمام مجلسوں میں خواہ وہ عدالتی اجتماع ہو یا پارلیمنٹ کا اجلاس حصہ لینے والوں کو معاوضہ تو ایک طرف سفرخرچ تک نہ ملتا تھا جس کی غرض بظاہر یہ تھی کہ اُن کی شان قائم رہے لیکن اصل میں یہ تھی کہ متوسط آمدنی کے لوگوں کو اپنے حقوق کی نمائندگی آپ کرنے کا موقع نہ ملے۔ اس لئے مجسٹریٹ یا ممبر پارلیمنٹ وہی شخص ہوسکتا تھا جو معقول آمدنی رکھتا ہو یعنی ہر طرح کی سیاست پر ارباب دولت بلاشرکت غیرے قابض تھے۔

اس کا بھی امکان نہ تھا کہ اہل علم کے طبقے میں سے کوئی مخالف حکومت جماعت کھڑی ہوسکے کیونکہ تمام علمی پیشے دولتمند طبقے والوں نے اپنے اور اپنے دوستوں کے لئے مخصوص کر رکھے تھے۔ یونیورسٹیاں سب کی سب اور اسکول نوے فیصدی سرکاری کلیسا کے ہاتھ میں تھے جو سوائے اپنے اطاعت مندوں کے اور کسی کو تعلیم پانے کی اجازت نہ دیتا تھا اور اس بات کی پوری کوشش کرتا تھا کہ سب پادری، طبیب، قانون داں، انگلیکن فرقے کے یعنی بالفاظ دیگر پرانے حکمران خاندانوں کے ہوں۔ سرکاری کلیسا کی قوت اس قدر وسیع تھی کہ خود وہ لوگ بھی جو کھلم کھلا اُس کے مخالف تھے، اُس کے اثر سے خالی نہ تھے۔ کوئی اصطباغ یا نکاح کی رسم جو کسی انگلیکن پادری کے ہاتھ سے ادا نہ ہوئی ہو جائز نہیں قرار دی جاتی تھی کسی مرُدے کو بجز مقامی پادری یا اس کے نمائندے کے کوئی اور شخص دفن نہیں کر سکتا تھا۔ آزاد مصنف بھی اب تک عدیدی حکومت کے لئے خطرناک نہ تھے۔ اٹھارھویں صدی کے بہترین ارباب فکر میں سے اکثر مثلاً اسٹیل، بالنگ بروک، شیفٹسبری، چیسٹر فیلڈ، فیلڈنگ ہسٹن، ہوریس

والپول، حکمراں طبقے کے تھے اور بقیہ مثلاً ایڈیسن، پوپ، سوئفٹ، ینگ وغیرہ اس طبقے کے زیرسایہ تھے۔ تصنیف و تالیف سے اب تک کسی کی روزی نہیں چلتی تھی اور ارباب جاہ کے دریوزہ سائی کئے بغیر کامیابی محال تھی۔ ایسی بڑی شخصیت کے لوگ جیسے پوپ اور سوئفٹ (اور ان سے پہلے سولھویں صدی میں اسپنسر) حکام اور امرا کی دربار داری کرتے تھے۔ ڈیفو کچھ دن تک مخالف حکومت رہا لیکن آخر میں حکام کا آلۂ کار بن گیا۔ صرف سموئل جانسن کو یہ بات نصیب ہوئی کہ بغیر بیرونی امداد کے ملک کا ذہنی رہنما بن جائے لیکن وہ بھی سیاست میں حکومت کے آگے سر تسلیم خم کرتا تھا۔ جب کبھی سختی سے حکومت کی مخالفت کیجاتی تھی جس طرح "جونیس" کے خطوط میں (۱۷۶۹ء تا ۱۷۷۲ء) کی گئی تو لوگوں کو اس قدر حیرت ہوتی تھی جس کا ہم آج کل اندازہ بھی نہیں کرسکتے اور مخالفت کرنے والے اپنا نام پوشیدہ رکھنے پر مجبور تھے۔ جب ۱۷۶۰ء اور ۱۷۷۰ء کے درمیان ایک منچلے مضمون نگار جان ولکس نے حکومت کے مخالف پارٹی قائم کرنے کی کوشش کی تو لوگوں نے اُسے اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔

سیدھے سادے ذرائع سے جو باہر سے دیکھنے والے کو نظر بھی نہ آتے تھے طبقۂ امرا نے ایسی دانشمندانہ اور جابرانہ حکومت قائم کر رکھی تھی، جس کی دنیا میں کہیں نظیر نہیں ملتی، انتہائی تشدد کے ساتھ ملک کی سیاست ایسے سانچے میں ڈھالی جاتی تھی کہ اُس سے زمینداروں کی اغراض کو مدد پہنچے۔ غلہ کی قیمت کو گراں رکھنا معاشیاتی سیاست کا سب سے کارگر حربہ تھا۔ رفاہ عام کے لئے جو محصول لگائے جاتے تھے، مثلاً امداد غربا کا ٹیکس جو صنعتی دور کے آغاز کے بعد سے برابر بڑھ رہا تھا، اُن سے حکمراں زمیندار صاحبان حتی الامکان بچ نکلتے تھے۔ شکار کے جابرانہ قوانین محض شکار کھیلنے والے امرا کی اغراض کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے تھے۔ ڈسینٹر (غیر مقلد) لوگ جن کے حلقوں میں زیادہ تر نیچے طبقے والے تھے نہایت سختی کے ساتھ دبائے جاتے تھے۔ کہیں ۱۸۲۸ء میں جاکر انھیں میونسپلٹیوں وغیرہ میں منتخب ہونے کا حق دیا گیا۔ ۱۸۱۲ء میں اُن بندشوں میں سے جو اسٹوآرٹ بادشاہوں کے زمانے سے ان کی عبادت پر عائد تھیں آخری بندش ہٹائی گئی ۱۸۳۳ء

میں وہ محصول جو سرکاری کی طرف سے اُن پر عائد کیا جاتا تھا معاف کیا گیا۔ نکاح کی رسم ۱۸۳۶ء تک، اور تدفین کی ۱۸۸۰ء تک سرکاری کلیسا کے مخصوص اختیارات میں شامل رہی۔ غرض انیسویں صدی کے وسط تک ڈسینٹر لوگوں کی، جن میں ملک کی نصف بلکہ نصف سے زیادہ آبادی شامل تھی، یہ حیثیت رہی کہ طوعاً وکرہاً اُن کا وجود برداشت کیا جاتا تھا۔ مگر انگلستان کی یہ

ملک پر کتنی ہی بار کیوں نہ ہو اس کا ظاہری برتاؤ نرم ہے اور باوجود اس کے کہ وہ اپنا قبضہ بلاشرکت غیرے قائم رکھنے کے لئے سخت سے سخت قوانین بناتی ہے ان کے عملدرآمد میں وہ بڑی حد تک انسانیت سے کام لیتی ہے، اُس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ از راہ دانشمندی نیچے طبقے کے چیدہ لوگوں کو اپنے طبقے میں شامل کرتی رہی ہے۔ یہ وسعت نظر ان لوگوں کا خاصہ ہے جو محض حکومت کے بھوکے نہیں بلکہ حکومت کے اہل ہیں اور جو اپنی قوت کے حدود کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ چیز انگریزوں کی سرشت میں معلوم ہوتی ہے۔ انگلستان کے چھوٹے امرا نے جنھیں (GENTRY) کہتے ہیں قرون وسطیٰ میں اس بات کی کبھی کوشش نہیں کی کہ وہ خواہ مخواہ گھس بیٹھ کر کے بڑے امرا میں شامل ہوں اور جب دارالعوام اور دارالامرا الگ الگ ہوگئے تو یہ لوگ دارالعوام میں شہروں کے ساتھ مل گئے۔ یہاں صدیوں تک شہر والوں کو غلبہ حاصل رہا لیکن آہستہ آہستہ امرا نے اس مجلس کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ یہاں بخلاف برِ اعظم کے یہ رسم ہے کہ ہر امیر کا خطاب اور جائداد کا قبضہ بلاشرکت غیرے اُس کے بڑے بیٹے کو ملتا ہے۔ اس کے سبب سے یہاں مفلس، بیجا غرور کرنے والے، بیکار امرا پیدا نہیں ہونے پائے اور امرا اور شہر کے شرفا آسانی سے مل جل گئے۔ امرا کے بعض خاندان مثلاً لا پول چودھویں صدی میں مرفہ الحال تاجر تھے مگر بڑھتے بڑھتے امرا میں شامل ہو گئے۔ مشہور شاعر چاسر جو اپنے نسب اور انداز طبیعت کے لحاظ سے متوسط طبقے کا تھا چودھویں صدی کے آخر میں، رفیق خاص، سفیر، ملک الشعرا کے عہدوں پر فائز تھا جو امرا کے لئے مخصوص تھے۔

اٹھارھویں صدی میں بھی نئے امرا نے جو برسر حکومت تھے دانشمندی اور سلیقے کے

ساتھ اپنے حلقے کو وسیع کیا جس کے سبب سے ایک صدی تک لوگوں کو عدیدیت کا وجود محسوس نہ ہوا۔ کاریگروں کے لڑکے جو صلاحیت رکھتے تھے ہائی اسکول کی تعلیم سے نہیں روکے جاتے تھے بلکہ اکثر یونیورسٹی کی تعلیم پاکر ملک کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ بس اتنی شرط تھی کہ وہ انگلیکن مذہب قبول کرلیں، اور چونکہ اصولاً سوائے سرکاری کلیسا کے کسی اور مذہب کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا اس لئے اس تبدیل مذہب کے لئے نہ کسی خاص رسم کی ضرورت تھی اور نہ پرانے عقائد سے باضابطہ توبہ کرنے کی۔ نوجوان طالب علم کو یونیورسٹی میں داخل ہوتے وقت بس اتنا کہنا پڑتا تھا کہ وہ انگلستان کے کلیسا کے ۳۹ عقائد کو مانتا ہے۔ اس کے بعد حکومت کے انتہائی مراتب پر پہنچنے کے لئے اُسے کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی کسی قسم کے محتسبانہ سوالوں کا جواب نہیں دینا پڑتا تھا، کلیسا کی ظاہری رسوم و عبادات کی کوئی پابندی نہ تھی۔ اور جو دولتمند تاجر، یا صنعتی کارخانوں کا مالک حکمراں طبقے کی نظروں میں عزت حاصل کرنا چاہتا اُسے بس سرکاری کلیسا کا رکن ہوجانا کافی تھا جس میں کسی باضابطہ داخلے کی ضرورت نہ تھی اور جس کے اصول اپنی وسعت کی وجہ سے تمام فرقوں کے عقائد کے لئے گنجائش رکھتے تھے۔ اگر وہ کافی دولتمند ہوتا اس کا بہت امکان تھا کہ اُس کی لڑکی کی شادی کسی "امیر" سے ہوجائے یا وہ خود آخر عمر میں طبقہ امرا میں شامل کرلیا جائے اور اس طرح اُس کی ذات اور اُس کی دولت حکمراں طبقے کے لئے مزید تقویت کا ذریعہ بن جائے۔ خصوصاً جو بے اندازہ دولت اٹھارہویں صدی میں ہندوستان سے انگلستان پہنچی وہ سب کی سب زمیندار امرا نے اس کے مالکوں کے یہاں شادی کرکے یا انھیں مرتبۂ امارت عطا کرکے اپنے طبقے میں کھینچ لی۔ یہ جذب کرنے کا عمل اب تک جاری ہے اور پچھلے قرنوں میں اس کی رفتار اس قدر تیز ہوگئی ہے کہ قدیم امرا کا وجود معرض خطر میں آگیا ہے۔ انگلستان میں جو شخص کسی اقتصادی کاروبار میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرے اُسے یہ توقع رہتی ہے کہ وہ اپنی کاروباری زندگی کو ختم کرنے کے بعد نائٹ یا بیرونٹ کا خطاب پاکر "GANTRY" (امرا کے طبقۂ ادنیٰ) میں شامل ہوجائے گا یا لارڈ کا خطاب حاصل کرکے ARISTOCRACY (امرا کے طبقۂ اعلیٰ) میں جگہ پائے گا اور دارالامرا کا رکن ہوجائے گا۔ (ترجمہ)

فنستان(۱) میں مسلمانوں کی ایک جماعت

۲۴ر اپریل ۱۹۲۵ء کو فنستانی حکومت کی مجلس اعلیٰ نے فنستان میں رہنے والے مسلمانوں کے متعلق ایک فیصلہ کیا جس کی بدولت اسلام کا سرکاری ضابطے کے طور پر ان مذہبوں میں شمار ہونے لگا جو ملک میں رائج ہیں۔ فنستان کے یہ مسلمان علاقے ایدل اورال کے ترک تاتار ہیں۔ روس میں جب بولشویک انقلاب ہوا تو یہ ہجرت کر کے شمال کی طرف چلے گئے اور فنستان میں آباد ہو گئے۔ ان میں سے بعض فنستان سے بخوبی واقف تھے، کیونکہ وہ انقلاب کے پہلے بھی تجارتی مال اور خصوصاً کپڑا وہاں لے جا کر بیچتے تھے۔ ان کی تعداد اس وقت ۶۰۰ ہے، یعنی سو سے کچھ اوپر خاندان۔ وہ ستره مختلف شہروں میں بسے ہیں، مگر زیادہ تر ہلنگ فورز، اور تورکو میں آباد ہیں۔ قریب قریب سب سمور اور کپڑے کی تجارت کرتے ہیں۔ ان میں سے بہتیرے خوش حال ہیں اور سب کے سب صلح پسند اور کارگزار ہونے کی شہرت رکھتے ہیں

روس کے بجائے اب ان کا بیشتر حصہ فنستان کی رعایا بن گیا ہے۔ فنستان میں مذہبی آزادی کے قانون کی سختی کے ساتھ پابندی کیجاتی ہے، اس لئے یہ مسلمان بلا کم و کاست فنستانی شہریوں کے تمام حقوق کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مثلاً سرکاری ملازمتوں کا دروازہ ان پر بند نہیں ہے۔ مگر دوسری طرف شہریت کے نقطہ نظر سے بعض قاعدے ہیں جن پر عمل کرنا مسلمانوں کے لئے لازمی نہیں رکھا گیا ہے۔ ان کے یہاں نکاح امام پڑھاتا ہے، جو ولادتیں ہوتی ہیں وہ بھی اسی کے یہاں رجسٹر میں درج ہوتی ہیں اور وہ بس سال کے آخر میں اعداد و شمار کے طور پر سرکار میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

---

(۱) فنستان، یورپ کا سب سے شمالی ملک، روس کے شمال و مغرب، اسوئیڈن کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہ مضمون (REVUE DES ETUDES ISLAMIQUES) سے ماخوذ ہے۔

لیکن مسلمانوں کی آزادی خاص طور پر ان کی معاشرت میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ آپس ہی میں شادی بیاہ کرتے ہیں اور ان کے یہاں مہر کا رواج ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں ازدواجی تعلقات قائم ہونے کی مثالیں بھی ملتی ہیں ایسی حالت میں عیسائی عام طور سے مسلمان ہوجاتے ہیں۔ اگر وہ نہیں ہوتے تو کچھ فساد پیدا ہوتا ہے، کیونکہ بچوں کا مذہب طے نہیں ہوتا۔ لیکن بہرحال پیدائش کے دن ان کے نام امام ہی کے رجسٹر میں درج ہوتے ہیں۔

فنتانی مسلمان اس کی خاص فکر رکھتے ہیں کہ ان کے بچوں کو دین اور قومیت کی تعلیم دی جائے۔ اس ارادے سے انھوں نے اپنے اسکول کھولے ہیں جہاں بچے ہفتے میں دو تین دفعہ جاتے ہیں انھیں دینیات، تاریخ اسلام اور ترکوں کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے، قرآن شریف کی تلاوت کرنا سکھایا جاتا ہے، اور چند سورتیں حفظ کرا دی جاتی ہیں کہ وہ نماز پڑھ سکیں۔ ذریعۂ تعلیم ترکی زبان ہے۔ حروف پہچاننے اور تجوید کے علاوہ عربی زبان اور زیادہ نہیں سکھائی جاتی۔ ہمیں سمجھنا چاہئے کہ نئے ترکی لاطینی حروف ہی کی زیادہ قدر کی جاتی ہے۔

اسکولوں کی تعداد بہت نہیں ہے، دو، جن میں سے ایک ہانگ فورز اور ایک تمپیر میں ہی، سال میں نو مہینے کھلے رہتے ہیں۔ باقی ایسے مقامات پر ہیں جہاں مسلمان بس مٹھی بھر ہیں، وہ صرف سال میں تین مہینے کام کرتے ہیں اور ان کے معلم ایک سے دوسرے میں جاتے رہتے ہیں۔ اسکولوں کے علاوہ کانفرنسیں بھی ہوا کرتی ہیں جن کا موضوع بحث بدلتا رہتا ہے، کبھی تو مذہب ہوتا ہے، کبھی قومیت (یعنی ترکی قوم) کا مسئلہ، کبھی ترک مسلم تاریخ۔ کانفرنس کے کرانے والے یا تو اسکولوں کے معلم ہوتے ہیں یا آتے جاتے باہر کے مسلمان، خاص طور پر ترک۔ پچھلے سال ابراہیم عارف اللہ، فنتانی مسلمانوں کے اتحاد کے ناظم نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جس کا مقصد قومیت کی تبلیغ کرنا تھا۔

فنسانی مسلمانوں کا کسی خاص دینی مرکز سے تعلق نہیں۔ پہلے ان کا روس کی ریاست کازان سے کچھ واسطہ رہتا تھا، مگر انقلاب کے بعد وہ علیحدہ ہوگئے۔ قومی نقطۂ نظر سے اب انھوں نے جنوبی روس کو چھوڑ کر انگورا سے لگاؤ پیدا کیا ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ انھوں نے ترک لاطینی

حروف اختیار کرلئے ہیں۔ اس سے اور آگے بڑھ کر کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ترکوں کی قومی تحریک سے واقف رہیں اور دار الحکومت انگورا کے جو رسالے اور کتابیں شائع ہوتی ہیں انھیں پڑھتے رہتے ہیں۔ ہر سال وہ ترکی کی آزادی کی اہتمام سے برسی (۲۹ اکتوبر) مناتے ہیں اور اسی طرح ترکوں کا قومی دن (۲۳ اپریل) بھی ان کے لئے ایک تہوار ہوتا ہے۔ ہر مسلمان کے گھر میں مصطفےٰ کمال کی تصویر ہوتی ہے

فنستان میں کوئی جامع مسجد نہیں، لیکن تین چھوٹی مسجدیں ہیں، ایک ہلسنگ فورز، ایک تمپیر اور ایک ٹرکو میں جہاں کوئی مسجد نہیں ہے وہاں مومن مرد اور عورتیں سب کسی کے مکان پر جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے اکٹھا ہوجاتے ہیں۔ سوائے عید قرباں اور رمضاں کے عورتیں مسجدوں میں نہیں جاتی ہیں۔ امام صرف ایک ہے جس کی ضروریات ملت پوری کرتی ہے۔ اس کا مکان ہلسنگ فورز میں ہے، مگر وہ دوسرے شہروں کا ایک خاص معمول کے مطابق چکر لگاتا رہتا ہے جب امام موجود نہیں ہوتا تو مسلمانوں کی جماعت میں سے کوئی مناسب شخص امامت کرتا ہے۔ بارہ وفات کے دن مومن سب جمع ہوکر قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں، اور امام حسب موقع کسی موضوع پر تقریر کرتا ہے۔ دولت مند لوگ اس دن دعوتیں بھی کرتے ہیں۔

سخت سردی کے باوجود فنستانی مسلمان عام طور سے شراب نہیں پیتے، مذہبی تہواروں اور قومی تقریبوں کے سلسلے میں جو ضیافتیں ہوتی ہیں ان میں بھی کوئی نشہ کی چیز پیش نہیں کیجاتی کہا جاتا ہے کہ بیس برس کے عرصے میں کوئی مسلمان بدمستی کے الزام میں نہیں پکڑا گیا ہے۔ روزے کے معاملے میں فنستانی مسلمان زیادہ سخت نہیں ہیں۔ جون اور جولائی کے مہینوں میں جب دن بہت ہی زیادہ لمبا ہوتا ہے، روزہ رکھنا فرض نہیں سمجھا جاتا۔ جو چاہے وہ اس کے بدلے کسی دوسرے مہینے میں اپنا دینی فرض ادا کرسکتا ہے۔ حج کے لئے اب تک صرف ایک فنسانی مسلمان گیا ہے۔ وہاں لوگ کہتے ہیں کہ حج کے لئے زمانہ ٹھیک نہیں ہے، اور ترکستانی مسلمانوں کا قول ہے کہ جہاز پر حاجیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے کہ گویا وہ جانوروں سے بہتر نہیں۔

مسلمان عورتوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو فنستانی عورتوں کے ہوتے ہیں۔ ان کی آزادی صرف ایک حد تک ہے۔ مصنف سے کسی نے بیان کیا کہ وہ فنستانی مردوں کے ساتھ ناچتی نہیں ہیں مگر اسی کے بعد خاصے غمگین لہجے میں کہا کہ یہ بھی چند دنوں کے لئے ہے، فنستانی قانون کے مطابق عورت کی سترہ برس کی عمر سے پہلے شادی نہیں کی جاسکتی۔ مسلمانوں کا قاعدہ بھی یہی ہے۔ منگنیاں بالکل یورپی طرز پر ہوتی ہیں۔ پھر بھی یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ مسلمان عورتیں بھی اتنی ہی ترقی کر چکی ہیں جتنی کہ فنستانی۔

(ذیل میں اس قانون کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس کی رو سے فنستانی مسلمانوں کو ایک مذہبی جماعت کے حقوق دیے گئے ہیں اور جس کے ذریعے سے مسلمانوں نے اپنے اجتماعی نظام کو ایک قانونی حیثیت دیدی ہے)

مسلمانوں نے ایک مذہبی جماعت قائم کی ہے جس کا نام "فنستان کے مسلمانوں کی جماعت" ہے۔ انھوں نے متفقہ طور پر اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں کا ایک خاکہ تیار اور منظور کرلیا ہے اور اپنی جماعت کا ایک دستور بھی بنایا ہے۔ یہ حسب ذیل ہیں :-

(الف مذہب کے بنیادی اصول)

۱۔ دین اسلام پر اعتقاد رکھنا۔

۲۔ حکم شرع کے مطابق دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرنا اور جمعہ کو مسجد میں نماز باجماعت پڑھنا۔

۳۔ سال میں ایک مہینے کے روزے رکھنا۔

۴۔ خوشحال لوگوں کا محتاجوں کی مدد کرنا۔

۵۔ خوشحال لوگوں کا حج کو جانا

۶۔ تمام احکامات دینی کا احترام کرنا اور ان کی پابندی لازمی سمجھنا۔

۷۔ ضمیر کو پاک صاف رکھنا اور تندرست ہونا۔

۸۔ ایمانداری

۹۔ ہر انسان کا لحاظ کرنا اور کسی کو نقصان نہ پہنچانا۔

۱۰۔ دوسرے کے لئے وہی چاہنا جو انسان اپنے لئے چاہتا ہو، اور دوسرے کے لئے کوئی ایسی بات نہ چاہنا جو انسان اپنے لئے نہ چاہتا ہو۔

(ب) فنستان کے مسلمانوں کی جماعت کا دستور

۱۔ فنستان کے لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں اور ان تمام قواعد کی پیروی کرتے ہوں جو اوپر بیان کئے جا چکے ہیں ایک جماعت سمجھے جائیں گے۔

۲۔ اس جماعت میں کارکن اراکین ہوں گے اور ایسے بھی جو سن بلوغ کو نہیں پہنچے ہیں۔

۳۔ کارکن رکن ہونے کے لئے دین دار ہونا لازمی ہے۔ ہر رکن پر لازم ہے کہ جماعت کو اپنے مقاصد حاصل کرنے میں مدد دے۔ اراکین کا انتخاب جماعت کی مجلس منتظمہ کی تجویز پر ہوگا

۴۔ نوجوان اٹھارہ برس کے سن کو پہنچنے پر بالغ سمجھے جائیں گے اور اسی کے بعد وہ کارکن اراکین بن سکتے ہیں۔ انتخاب سے پہلے امام دینیات میں ان کا امتحان لے گا۔

۵۔ صرف کارکن اراکین کو جو جماعت کے کاروبار میں حصہ لینے کا حق ہوگا۔

۶۔ جماعت کو اس کا اختیار ہوگا کہ کسی رکن کو جس کا عمل قابل اعتراض ہو خارج کر دے۔ اس کارروائی کو انجام دینے کے لئے کارکن اراکین میں سے جتنے موجود ہوں ان کی دو تہائی کی اکثریت درکار ہوگی، اور اخراج کے فیصلے کی تحریری اطلاع اس شخص کو دی جائے گی جو رکن اس طرح سے خارج کیا گیا ہو وہ تحریری اطلاع ملنے کے تیس دن کے اندر مجلس منتظمہ کے سامنے اپیل کر سکتا ہے مجلس کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا

۷۔ مجلس منتظمہ اور دوسری انتظامی مجلسوں میں صرف معتبر کارکن اراکین منتخب ہو سکتے ہیں واعظ اور معلم کے فرائض وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جنھیں مجلس منتظمہ نامزد کرے۔

۸۔ جماعت جمعہ کی نماز ادا کرے گی۔ دینی اور قومی تقریبوں کے دن مجلس منتظمہ مقرر کرے گی۔

۹۔ عام کاروبار مجلس عامہ کی رائے کے مطابق انجام پائے گا۔ مجلس منتظمہ کے جلسے حسب

ضرورت یا پانچ اراکین کی درخواست پر منعقد ہوں گے۔

۱۰۔ مجلس عامہ کا اجلاس سال میں ایک مرتبہ فروری کے مہینے میں ہوگا۔

۱۱۔ ہر رکن کو رائے دینے کا حق ہوگا اور فیصلہ کثرت رائے سے ہوگا۔ اگر موافق اور مخالف تعداد میں برابر ہوں تو صدر کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ مذہبی معاملات میں فیصلہ دو تہائی کی کثرت رائے سے ہو سکے گا۔ اگر کسی مذہبی معاملے کو ایجنڈا میں شامل کرنا مقصود ہو تو مجلس عامہ کے اجلاس کی تاریخ سے ایک مہینہ پہلے تجویز مجلس منتظمہ میں پیش کر دینا چاہیئے۔

۱۲۔ جماعت کو توڑنے کا فیصلہ ۵/۴ کی کثرت رائے سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر جماعت ٹوٹ جائے تو اس کا تمام روپیہ کار خیر میں صرف کر دیا جائے گا۔

۱۳۔ . . . . مجلس منتظمہ امام اور چار اراکین پر مشتمل ہوگی جن کا انتخاب مجلس عامہ کے دوران اجلاس میں ہوگا۔ ہر مجلس تین سال کام کرے گی اور اپنے اراکین میں سے ایک صدر اور ایک ناظم سال بھر کے لئے منتخب کرے گی۔

۱۴۔ . . . . مجلس منتظمہ کے اختیار میں تمام اجتماعی معاملات ہوں گے اور وہ اپنے فرائض انجام دینے میں مفاد عامہ کا ہر طرح سے لحاظ رکھے گی۔ جماعت کا روپیہ بھی اسی کی تحویل میں رہے گا مجلس عامہ جو فیصلے کرے ان کی تعمیل کرانا بھی اسی کے ذمہ ہوگا۔

۱۵۔ مجلس منتظمہ کا صدر، یا اس کی عدم موجودگی میں امام جماعت کا وکیل ہوگا۔ جماعت کی طرف سے کاغذات وغیرہ پر دستخط کرنے کا اختیار صرف مجلس منتظمہ کے صدر یا امام کو ہوگا۔

۱۶۔ اگر مجلس کے کسی رکن کے خلاف عدالت فوجداری کی طرف سے کوئی کارروائی کی جائے تو وہ فوراً مجلس کی تحریک پر رکنیت سے خارج کر دیا جائے گا۔ خارج شدہ رکن مجلس عامہ میں اپیل کر سکتا ہے جس کا اجلاس بغیر کسی بیجا توقف کے ہوگا۔ مجلس عامہ کثرت رائے سے مجلس منتظمہ کے فیصلے کو رد کر سکتی ہے۔

اگر مجلس منتظمہ کا کوئی رکن اپنے فرائض سے غافل ہو جائے یا اس کا چال چلن بگڑ جائے تو

مجلس تین چوتھائی کی کثرت رائے سے اس کو برطرف کر سکتی ہے۔

۱۷۔ جماعت کے غیر معمولی اخراجات چندے کے ذریعے سے پورے کئے جائیں گے اگر ضرورت ہو تو ہر فرد کی حیثیت کے مطابق اس سے مزید چندہ لیا جا سکتا ہے۔

۱۸۔ ہر پندرہ سال کے بعد ایک کمیٹی مقرر کی جائے گی جو اس مدت کے تمام حسابات کو جانچے گی۔

۱۹۔ بچوں کی تعلیم کا انتظام جماعت کے سپرد ہو گا اور والدین کے لئے لازمی ہو گا کہ جماعت کے تجویز کئے ہوئے قواعد کی پابندی کریں۔ تعلیم کے اخراجات انھیں حسب استعداد ادا کرنا چاہئیں۔

۲۰۔ جماعت کی سرکاری زبان فنستانی زبان ہو گی، لیکن جلسوں میں قومی زبان یعنی ترکی زبان بولی جائے گی

۲۱۔ اگر جماعت کے کسی دو اراکین میں قانونی نزاع ہو تو ہر فریق اپنا ایک وکیل مقرر کرے گا۔ یہ وکیل مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لئے پنچ بن جائیں گے اور ایک تیسرے آدمی کو سرپنچ منتخب کرینگے دونوں فریق کو چاہئے کہ پنچوں کا فیصلہ تسلیم کریں۔ اگر ایسے افراد جن کے درمیان نزاع ہو تیس دن کے اندر وکیل مقرر نہ کریں، یا یہ وکیل سرپنچ کے انتخاب پر متفق نہ ہو سکیں تو مجلس منتظمہ خود وکیل اور سرپنچ نامزد کر دے گی۔

اُردو زبان کی تعلیم کے مقاصد

ہر کام کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اور کام شروع کرنے سے پہلے مقصد کی تعیین ضروری ہوتی ہے تاکہ تمام تر توجہ کو اُس کی تحصیل پر مرکوز کیا جا سکے۔ کام کرنے والے کے ذہن میں مقصد کا تصور جس قدر صاف اور مبہم ہوتا ہے کامیابی اسی قدر زیادہ یقینی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم تعلیم اردو کے مقاصد پر ابتدا ہی میں غور کرلیں اور اپنے نصب العین کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ جو نتائج اور اثرات ہم اپنی کوششوں سے پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ بالکل سلجھے ہوئے انداز میں ہمارے پیش نظر ہونے چاہئیں۔

اُردو کی تعلیم و تدریس کا سب سے پہلا اور سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ طلبہ اپنی مادری زبان سے محبت کرنے لگیں۔ اُن کے دلوں میں یہ احساس جاگزیں ہوجائے کہ اُردو زبان اُن کی اپنی چیز ہے اُن کے آبا و اجداد کی یادگار ہے، اُن کی قوم و ملک کے بہترین دماغوں کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے، ایک ملی و قومی سرمایہ ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ تعلیم و تدریس کے دوران میں اس قسم کے جذبات طلبہ کے قلوب میں پیدا کرنے کی کوشش کرے، اور کبھی اس خدمت سے غافل نہ ہو۔ وہ اُن کو بتائے کہ اردو زبان کی تاریخ ابتدا سے لے کر موجودہ زمانے تک کتنی شاندار، کتنی دلچسپ اور کتنی سبق آموز ہے۔ یہ زبان کیونکر ہندوؤں اور مسلمانوں کے تصادم سے وجود میں آئی کیونکر مختلف اقوام کے میل جول کا لازمی اور خوشگوار نتیجہ ہے، اور کس طرح وجود میں آنے کے بعد اس نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی ہے، یہاں تک کہ آج اُس کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ نقشۂ عالم کے دور دراز ملکوں میں اُس کے بسنے اور لکھنے والے موجود ہیں اور کیوں نہ ہو یہی تو وہ زبان ہے جس میں ہندی کا لوچ، فارسی کی شیرینی اور عربی کی فصاحت سبھی کچھ آکر جمع ہوگیا ہے۔ جس کی تعمیر میں دنیا کی بہت سی زبانوں نے حصہ لیا ہے۔ اور جس کے پرچار میں متعدد قوموں نے ایک دوسرے

کا ہاتھ بٹایا ہے۔ پھر بھی نہیں، اُردو زبان ایک عظیم القدر لٹریچر کی مایہ دار ہے اور وہ لٹریچر ایسا ہے کہ دنیا کے کسی قوم و ملک کے لٹریچر سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ ادبیات کا یہ بے بہا خزانہ ہماری تہذیب، ہمارے تمدن، ہمارے ذہنی ارتقا اور ہماری قومی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ علم اور آرٹ کی یہ وسیع اور عالیشان عمارت اُن گرامی قدر شعرا اور مصنفین کے ہمت و استقلال کی جیتی جاگتی یادگار ہے جنھوں نے اُردو کی خاطر کسی ایثار اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا جنھوں نے شدید ترین مصائب کے باوجود اُردو کی سرپرستی سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔

اس سلسلے میں سب سے آخری اور سب سے زیادہ ضروری بات طلبہ کے ذہن نشین کرنے کی یہ ہے کہ اُردو زبان کی ملکیت کا بار اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس کے ساتھ بہت سی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ اُردو کا مستقبل تمھارے ہاتھ میں ہے اور تم سے وابستہ ہے۔ تمھارا فرض ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرو تاکہ جب وقت آئے تو یہ امانت تمھارے سپرد کر دی جائے۔ تم کو اس امانت کی حفاظت کرنی ہوگی۔ اور پھر اس کو آئندہ نسلوں کے سپرد کر دینا ہوگا۔ تم کو ہر لحظہ اس امر کا خیال رکھنا ہوگا کہ اس کی پاکیزگی میں فرق نہ آنے پائے اور اس لئے ضروری ہے کہ تم ابھی سے اس پر اپنی بہترین توجہ صرف کرو۔

جب تک اس قسم کے جذبات اور اس نوع کی عصبیت ہم اپنے نونہالوں میں پیدا نہیں کریں گے ہماری تدریس کامیاب کہلانے کی مستحق نہیں ہوسکتی۔

اسکول کے مختلف طلبہ سوسائٹی کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، کوئی غریب گھرانے سے آتا ہے کوئی امیر خاندان سے۔ کسی کے والدین تعلیم یافتہ ہوتے ہیں کسی کے جاہل، کسی کے ہاں تجارت ذریعۂ معاش ہوتی ہے اور کسی کے ہاں صنعت و حرفت۔ غرض یہ کہ ہر بچہ ایک مختلف اور جداگانہ ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ سب کی تربیت جداگانہ ہوتی ہے۔ اگر ایک بچے کے ماں باپ صاحب ثروت ہونے کے علاوہ تعلیم یافتہ بھی ہیں تو یقیناً وہ اُس بچے سے زیادہ خوش قسمت ہے

جس کے والدین بے لکھے پڑھے بھی ہیں اور غیر مرفہ الحال بھی۔ اس لئے نہیں کہ وہ زیادہ آرام سے رہتا ہے، اچھا کھانا کھاتا ہے، اچھے کپڑے پہنتا ہے بلکہ اس لئے کہ اُس کا ماحول اپنے غریب بھائی کے ماحول سے زیادہ وسیع، زیادہ دلچسپ، زیادہ سبق آموز ہے۔ اس کا گرد و پیش اُس کے ذہنی ارتقاء میں زیادہ ممد ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس کی دنیائے خیال زیادہ فراخ ہے، اُس کا ذخیرۂ الفاظ زیادہ وسیع ہے، اُس کی قوتِ گویائی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ خیالات کے اظہار کے لئے وہ زیادہ اسالیب بیان سے واقف ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اُس کی آواز اور لہجے میں ایک خاص امتیازی شان پائی جاتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو سوسائٹی میں تفریق باہمی اور جماعتی عصبیت کو زندہ رکھتی ہے۔ کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقتاً صاحب ثروت والدین کے بچے غریبوں کے بچوں سے مختلف زبان بولتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو مختلف زبانیں بولتے ہیں کبھی ایک دوسرے کے ساتھ سچی ہمدردی نہیں کر سکتے۔ اُن میں رشتۂ محبت قائم نہیں ہو سکتا۔ زبان کا اختلاف غیریت کی ایک دیوار اُن کے درمیان حائل کر دیتا ہے۔

اسکول کا فرض یہ ہے کہ ان امتیازات اور اختلافات کو مٹائے۔ سوسائٹی کے ہر فرد کو قلبی و ذہنی نشو و نما کے یکساں مواقع دے۔ "گھر" کی کمیوں کی تلافی کرے۔ اور اسکول میں خاص طور پر اُردو کی تدریس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ طلبہ میں زبان کے اختلافات باقی نہ رہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ غریبوں کے بچے (جن میں دیہاتی طلبہ بھی شامل ہیں) "ماں کی زبان" کی بجائے مادری زبان بولنے لگیں۔ سب طلبہ کی زبان ایک ہو جائے یعنی صاف، سادہ، پاکیزہ اور آزاد اُردو۔

اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ اور ملک کے ہر گوشے میں بولی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جگہ مقامی رنگ کی جھلک اس میں پیدا ہو گئی ہے۔ اگر آپ لاہور سے روانہ ہوں اور دہلی، بریلی، لکھنؤ، بنارس، پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ جائیں تو ان اختلافات کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں پنجاب، بہار اور دوسرے صوبوں سے قطع نظر کہ وہاں بعض اوقات اُردو، اُردو نہیں معلوم ہوتی

خود یو۔پی میں زبان کے یہ اختلافات کچھ کم نمایاں نہیں ہیں۔ درآنحالیکہ یہ وہ خطّہ زمین ہے جو اُردو کا اصل وطن ہے۔ غالباً یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ یو۔پی کے دو ہمسایہ ضلعوں کی زبان میں بھی فرق پایا جاتا ہے یعنی ہر ضلعے کی زبان مقامی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ لیکن ان تمام اختلافات سے قطع نظر مستند اردو وہ ہے جو دہلی اور لکھنؤ کی زبان ہے اور جس کو ہندوستان کے تمام گذشتہ اور موجودہ اہل قلم نے اختیار کیا ہے۔ اور یہی وہ اردو ہے جو ہمارے اسکولوں میں مادری زبان کے طور پر پڑھائی جانی چاہئے۔ اور جس کو صحت اور سلاست کے ساتھ طلبہ میں رواج دینا ہماری تدریس کا ایک اہم مقصد ہونا چاہئے۔

صحت زبان کے سلسلے میں مجھے کچھ کہنا ہے۔ وہ یہ کہ دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو اختلافات ہیں وہ تاریخی ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر صحیح و جائز ہیں۔ مثال کے طور پر "سانس" دہلی میں مذکر ہے اور لکھنؤ میں مؤنث۔ "لفظ" دہلی میں مذکر ہے لیکن لکھنؤ میں مؤنث بھی ہے۔ دہلی میں "آپ کے ہاں" اور لکھنؤ میں "آپ کے وہاں" مستعمل ہے۔ دہلی میں "ہم جیسے" کہتے ہیں تو لکھنؤ میں "ہم ایسے" بولتے ہیں۔ "تیتری" کو لکھنؤ والے "تتلی" بولتے ہیں اور "کونسا" کی بجائے صرف "کون" استعمال کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ دونوں صورتیں جائز اور فصیح ہیں۔ اور باہر والوں کو ان دونوں میں سے کسی ایک کی مطابقت لازمی ہے۔ اس اعتبار سے یو۔پی دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ وہ جو اہل دہلی کا پیرو ہے اور دوسرا وہ جو لکھنؤ والوں کی تتبع کرتا ہے۔ مثلاً مراد آباد والے دہلی کی زبان بولتے اور لکھتے ہیں اور بریلی والوں کی زبان کا انداز لکھنوی ہے لیکن بعض مقامات پر اردو تعلیم یافتہ طبقے میں بھی غلط بولی جاتی ہے یعنی الفاظ کا استعمال دہلی اور لکھنؤ کے خلاف کیا جاتا ہے۔ مثلاً "آواز" کو روہیلکھنڈ میں بعض پڑھے لکھے لوگ بھی مذکر بولتے ہیں۔ یعنی "میری آواز" کی بجائے "میرا آواز" کہتے ہیں۔ "بھتیجی" کو "بھوڑیا"، "چھپنا" کو "چھپنا" اور "گرہ" کو "گانٹھ" کہتے ہیں۔ یا پھر اودھ میں بعض مذکر الفاظ مثلاً "آرام" اور "چین" کو مونث بولتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ اہل پنجاب کی زبان میں اس نوع کی غلطیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اُن کے ہاں صرف تعلیم یافتہ اشخاص ہی نہیں بلکہ اکثر ادیب بھی "اُس سے کہو" کی بجائے "اُس کو کہو"، "میں کار خریدنے والا ہوں" کی بجائے "میں کار خریدنے لگا ہوں"، "میں نے مدت

سے اُس کو خط نہیں لکھا" کی بجائے "میں نے بڑی دیر سے اُس کو خط نہیں لکھا"، "چپکے ہو جاؤ" کی بجائے "چپ جاؤ" اور "ٹال جاؤ" کی بجائے "ٹلا جاؤ" بولتے اور لکھتے ہیں۔ اسی طرح پٹنہ اور حیدرآباد کی مقامی غلطیاں ہیں۔ پھر کچھ ایسی بھی ہیں جو بغیر کسی مقامی تخصیص کے ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ اُردو کے مدرسین کا فرض ہے کہ اپنے طلبہ کو ان غلطیوں کے ارتکاب سے آزاد کریں۔ یہ اصلاحِ زبان اسکول کی چار دیواری سے شروع ہوگی اور طلبہ کے ذریعے عوام تک پہنچے گی۔ اور اس کا سہرہ اردو کے اساتذہ کے سر ہوگا۔

لیکن میری اس تمام تحریر سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ میں صرف دہلی اور لکھنؤ ہی کو اردو کا مرکز سمجھتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ جب تک مقامی امتیازات نہ مٹائے جائیں گے اُردو کو حقیقی فروغ حاصل نہ ہوگا۔ اور اب تو یوں بھی اُردو دہلی اور لکھنؤ کی پابندیوں سے آزادی حاصل کر چکی ہے۔ میری تحریر کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ اُردو کے مدرسین جب تدریس کا ایک مقصد یہ بھی سمجھتے ہیں کہ طلبہ زبان کو صحت اور سلاست کے ساتھ بولیں اور لکھیں تو اُن کے سامنے زبان کا ایک معیار بھی ہونا چاہئے۔ یہ معیار جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں ہندوستان کے مستند ادبا کی زبان ہے اور ہندوستان کے مستند ادبا، وہ زبان بولتے اور لکھتے ہیں جو دہلی اور لکھنؤ میں رائج ہے۔

اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اساتذہ کو قسم قسم کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مثلاً جہاں اکثر طلبہ ایسے ہوتے ہیں جن کی اُردو بہت کمزور ہوتی ہے اور جو اظہار خیال کی کوئی قدرت نہیں رکھتے وہاں بعض طلبہ ایسے بھی ملتے ہیں جو عالمانہ اور فاضلانہ زبان کے استعمال پر مصر ہوتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بہترین زبان وہ ہے جو فارسی الفاظ اور عربی تراکیب سے لبریز ہو جس میں جملے طویل اور الجھے ہوئے ہوں، جس میں "فصاحت" اور "بلاغت" پائی جائے۔ وہ گفتگو بھی کریں گے تو بعض اوقات معلوم ہوگا کہ کوئی پلیٹ فارم پر تقریر کر رہا ہے۔ استاد کا فرض یہ ہے کہ وہ قدم قدم پر طلبہ کو بتاتا رہے اور نمونے پیش کر کے بھی سمجھاتا رہے کہ تحریر ہو یا تقریر، زبان کا بہترین زیور سلاست ہی۔ ثقیل الفاظ اور

نامانوس ترکیبیں عامیانہ زبان سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہیں۔ اور تقریر کا مقصد یہ ہی کہ تحریر کو شستہ اور شگفتہ بنائے نہ یہ کہ تحریر، تقریر کو بھدا اور کرخت کر دے۔

اپنی مادری زبان کو سلاست، روانی اور صفائی کے ساتھ بولنا اور لکھنا ایک ایسا ہنر ہے جس کی اہمیت ناقابلِ انکار ہے۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے بہت سی باتوں کی ضرورت ہے اور اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنی زبان پر پوری دسترس حاصل ہو۔ تحریر ہو یا تقریر وہ اپنے خیالات کو وضاحت اور برجستگی کے ساتھ موثر پیرائے میں ادا کر سکے۔ اکثر لوگ بات کرتے وقت مناسب اور صحیح الفاظ نہیں پاتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ادھورے، نامکمل اور پھُسپھسے فقرے بولتے ہیں۔ اُن کی گفتگو میں ڈھیلا ڈھالا پن پایا جاتا ہے چستی نہیں ہوتی۔ دماغ میں خیالات کی لرزش ہوتی ہے، ہونٹ کانپتے ہیں لیکن اُن کو ادا نہیں کر سکتے۔ الفاظ کی یہ کمی جذبات اور شخصیت کی سچی ترجمانی میں مخل ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے سامعین کو متاثر کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اُن میں یہ لسانی ضعف نہ پایا جاتا تو منازلِ ترقی قطع کرنے میں اُن کو کتنی آسانی ہوئی ہوتی اور آج دنیا میں اُن کا کیا مرتبہ ہوتا۔ زبان کا جادو مشہور ہی اور کسے جرأت ہے جو اس سحرِ حلال سے انکار کرے۔ پھر اگر یہ سچ ہے کہ جادو بیانی اور جادو نگاری خداداد صلاحیتیں ہیں تو اس میں بھی کلام نہیں کہ ہر شخص، کم از کم جہاں تک مادری زبان کا تعلق ہے اپنی تحریر و تقریر میں صحت، برجستگی اور قوت پیدا کر سکتا ہے۔ اُردو کی تعلیم کے سلسلے میں یہ مقصد ہر وقت پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔

علوم و فنون کے میدان میں ذہنِ انسانی نے جس قدر تگ و تاز کی ہے وہ سب کتابوں میں محفوظ ہے۔ اگر ہم اپنے آبا و اجداد کی علمی و فنی جد و جہد سے واقف، اور اُس جد و جہد کے نتائج سے مستفید ہونا چاہتے ہیں۔ اگر ہم صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ کہلانا چاہتے ہیں — تو ان کتابوں کا تھوڑا بہت مطالعہ ہمارا فرض ہے پھر مطالعہ اس کو نہیں کہتے کہ کسی کتاب کو شروع سے آخر

تک ایک دفعہ پڑھ لیا جائے ۔ بلکہ مطالعہ نام ہے کسی علمی تحریر کو اس طرح پڑھنے کا کہ اُس کی تمام معنویت ہمارے ذخیرۂ ذہنی کا ایک مستقل جزو بن جائے ۔ چنانچہ اگر ایک طرف اس کی ضرورت ہے کہ طلبہ میں مطالعے کا ذوق و شوق پیدا کیا جائے تو دوسری طرف یہ بھی کچھ اہم نہیں کہ اُن کو صحیح خطوط پر مطالعہ کرنے کے طریقے بتائے جائیں ۔ یہ صحیح ہے کہ کامیاب مطالعہ کے اصولوں سے طلبہ کو آگاہ کرنا صرف اُردو ہی کے معلم کا فرض نہیں بلکہ دوسرے مضامین کے اساتذہ کو بھی اس طرف توجہ کرنا لازمی ہے ، لیکن زبان کی تدریس میں یہ کام جس قدر اہم ہے اُسی قدر اچھے نتائج کے ساتھ انجام بھی دیا جا سکتا ہے ۔

چنانچہ اُردو کی تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی تدریس کے ذریعے طلبہ میں مطالعہ کی عادت پیدا کریں تاکہ وہ جب تک اسکول میں ہیں اپنی درسی کتابوں کے علاوہ بھی کچھ کتابیں پڑھیں اور جب اسکول سے باہر جائیں تو کتب بینی کو روزانہ مشاغل میں شامل کر کے اپنے علم اور تجربے کو وسیع کرتے رہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم ان کو مطالعے کے صحیح طریقوں سے واقف کرنے کی ہر ممکن کوشش عمل میں لائیں تاکہ اُن کا مطالعہ کامیاب ہو اور جو کچھ پڑھیں اُس سے صحیح معنوں میں مستفید ہوں ۔

ادب حیاتِ انسانی کی تفسیر ہے اور مطالعۂ ادب کا مقصد یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کے مختلف اور متنوع مناظر کے ساتھ ایک قلبی و روحانی تعلق قائم کیا جائے ۔ مطالعہ ادب کا اثر ہماری زندگی پر نہایت خوشگوار ہوتا ہے ۔ ہمارے خیالات میں بلندی اور پاکیزگی ، جذبات میں متانت اور استواری ، اور اخلاق میں تہذیب پیدا ہوتی ہے ۔ جب ہم کسی بلند پایہ شاعر کا کلام پڑھتے ہیں تو ہم کو ایک ذہنی مسرت اور ایک قلبی راحت حاصل ہوتی ہے ۔ اور کم از کم تھوڑی دیر کے لئے ہم اس مادی دنیا اور اُس کے علائق سے آزاد ہو جاتے ہیں ، ہم ایک روحانی شگفتگی محسوس کرتے ہیں ۔ مجموعی حیثیت سے اس مطالعہ کا اثر ہماری روزانہ زندگی پر نہایت مفید ہوتا ہے اور یہ اثر ایسا

ہے کہ کسی اور ذریعے سے پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ جو شخص مطالعۂ ادب سے محروم ہے وہ زندگی کی ایک پاکیزہ ترین مسرت سے ناآشنا ہے۔ اور صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو ادبیات کے مطالعے سے دلچسپی رکھتے ہیں، جو اس مطالعے کو اپنی زندگی کا ایک محبوب مشغلہ سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے لوگ بہت کم بہت ہی کم ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص نے اسکول میں کم سے کم پانچ چھ برس اُردو زبان پڑھی ہے اور ہم اپنے اکثر بہترین شعرا، اور اُدبار کے ناموں سے واقف ہیں۔ جستہ جستہ اُن کے کلام و تصانیف کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی محدود ہے جنھوں نے اسکول سے نکلنے کے بعد ان شعرا و اُدبار کا زیادہ وسیع مطالعہ کرنے اور ادبیات کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو ادب کا مطالعہ تو درکنار، ادبی کتابوں کے وجود سے بھی بے خبر ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں کبھی کوئی ادبی کتاب نہیں خریدتے کبھی کوئی حقیر سے حقیر رقم ایک ادبی رسالے کی سرپرستی میں خرچ کرنے کے روادار نہیں ہوتے۔ شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ اُردو زبان کا موجودہ دور اخبارات و رسائل کا دور ہے، صحافت کا دور ہے۔ اور یہ ادبی صحیفے زبان کی وسعت اور ترقی کے آئینہ دار ہیں، ان کا مطالعہ لازمی ہے۔ کتب فروش فریاد کرتے ہیں کہ کوئی اُن کی کتابیں نہیں خریدتا، رسالوں کے ایڈیٹر چیختے چیختے تنگ آگئے، اُن کے گلے بیٹھ گئے۔ لیکن اس بھرے ہندوستان میں جہاں کروڑوں اُردو بولنے اور لکھنے والے موجود ہیں کسی کا مقصد خدمت زبان کی بجائے روپیہ سمیٹنا ہوتا ہے لیکن کچھ رسالے ایسے ضرور ہیں جن کا مطالعہ ہر تعلیم یافتہ اور باذوق انسان کے لئے مفید اور دلچسپ ہو سکتا ہے۔ اُردو زبان و ادب کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ ملک میں خوش ذوق لوگوں کا مکمل فقدان ہے۔

اُردو کے استاد کے لئے زریں موقعہ ہے کہ ملک کو بدمذاقی کی لعنت سے رہا کرے۔ اور دنیا کو اپنا ممنون کرم بنائے۔ انسانی ذہن میں "دلچسپیاں" پیدا کرنے کا بہترین وقت بچپن کا زمانہ ہوتا ہے۔ ادبی ذوق بھی اسی زمانے میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اُردو کی تدریس اس انداز سے

ہونی چاہئے کہ طلبہ نظم و نثر کے بہترین کارناموں سے حظ اندوز ہونے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں اُن کے مذاق کی تربیت ہو، اُن کا وجدان بیدار ہو اور وہ اپنی زبان سے محبت کرنے کے علاوہ اُس کے لٹریچر میں زیادہ دلچسپی لینے لگیں۔ اُن میں مطالعے کا شوق پیدا ہو اور پھر یہ مطالعہ اُن کی زندگی کا ایک مستقل اور ایک نہایت محبوب شغل بن جائے۔

تو گویا ہماری تدریس کا ایک نہایت اہم مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے طلبہ کو نظم و نثر کے مطالعے سے لطف اٹھانے کی ایسی تعلیم دیں، زبان و ادب کا ایسا ذوق و شوق پیدا کریں کہ مطالعۂ ادب اُن کی آئندہ مصروفیات و مشاغل کا ایک اہم جزو بن جائے، کہ ملک سے بدمذاقی کو دور کرنے اور ادبیات کو فروغ دینے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔

علم النفس کے نقطۂ نظر سے ہر بچہ اپنے اندر نہ صرف تحسین کا مادہ رکھتا ہے بلکہ تخلیقی قوت کا بھی مایہ دار ہوتا ہے۔ ایک حسین چیز جب ایک بچے کے سامنے لائی جاتی ہے تو وہ اُس کو دیکھ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ یہی احساس وہ بنیاد ہے جس پر موزوں تربیت کے ذریعے سے جمالیاتی ذوق کی عمارت کھڑی کیجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر بچہ جذبات اور محسوسات کی دنیا میں رہتا ہے۔ وہ اس قدر سوچتا نہیں جس قدر کہ محسوس کرتا ہے۔ اور پھر ان جذبات و محسوسات کے اظہار کا بھی خواہاں ہوتا ہے۔ یہی اُس کی تخلیقی قوت ہے۔

اُردو کی تدریس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ کی وجدانی قوتیں بیدار کر کے ان کو تخلیق پر آمادہ کیا جائے۔ مضمون نگاری، انشا پردازی، شعر گوئی اور دیگر اصناف ادب میں طلبہ کی ہمت افزائی کرنی چاہئے۔ بچوں میں "نقل" کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور جو کچھ وہ سیکھتے ہیں اسی فطری صلاحیت کے ذریعے سیکھتے ہیں۔ چنانچہ اُن کو آرٹ اور لٹریچر کے بہترین تخلیقی کارناموں کی "نقل" پر آمادہ کرنا چاہئے۔ وہ اس کام کو بڑی مستعدی اور دلچسپی سے کریں گے اور اس میں ایک حقیقی مسرت محسوس کریں گے۔

طلبہ کو تخلیق ادب پر آمادہ کرنے کا مقصد یہ نہیں ہو کہ غیر فانی شعرا اور اُدبا پیدا کئے جائیں۔ اسکول اس خدمت کے لئے نہیں ہے بلکہ اُس کا مدعا صرف اتنا ہے کہ جن طلبہ میں ادبی صلاحیتیں ہیں اور جن کے متعلق توقع کیجاتی ہے کہ قوم و ملک کے آئندہ ممتاز اہل قلم ہوں گے اُن کی ہمت افزائی ہو، اور تخلیقی قوتیں فنا نہ ہو جائیں۔

اُردو کی تدریس کا ایک اور مقصد یہ ہے کہ طلبہ اُن تمام مسائل میں جو اُردو زبان کی موجودہ اور گزشتہ حالت سے متعلق ہیں ایک گہری دلچسپی لینے لگیں۔ وہ ذوق و شوق کے ساتھ زبان کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ اور پھر زبان کی موجودہ شکل کے حسن و قبح پر غور کریں۔ اسکول چھوڑنے سے پہلے اُن میں کم از کم آزاد اور بے لاگ تنقید کا مادہ پیدا ہو جائے۔ وہ اس لائق ہو جائیں کہ مختلف ادبی مسائل پر اظہارِ خیال کر سکیں۔ اردو سے متعلق سیکڑوں مسائل ایسے ہیں جو متنازعہ فیہ ہیں جن کے متعلق بہت اختلاف رائے ہے۔ ہماری تدریس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ طلبہ ان تمام مسائل اور اُن کی اہمیت سے آگاہ ہو جائیں۔ اور اُن کے متعلق اپنی رائے قائم کر سکیں۔

ہمارے مقاصد کی فہرست نامکمل رہے گی اگر ہم ایک مقصد کو نذر انداز کر دیں۔ اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے، لیکن بدقسمتی سے اکثر لوگ اسے ایسا نہیں سمجھتے۔ اسکولوں میں اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ یہ امر اپنے طلبہ کے ذہن نشین کرا دیں تاکہ مسلمان طلبہ یہ خیال کرنا چھوڑ دیں کہ اُردو زبان ہماری اور صرف ہماری ہے۔ اور ہندو طلبہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کو اُردو زبان سے کوئی واسطہ نہیں، وہ تو ایک اسلامی چیز ہے۔ اس کی بجائے ہر طالب علم خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا فرد ہو اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ زبان سمجھے اور کم سے کم ادبیات کے دائرے میں تو مذہبی تعصب نہ رہے۔ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہندوؤں نے اس کی تعمیر میں بہت کافی حصہ لیا ہے۔ زبان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے جب

طلبہ کو تاریخی شواہد سے واقفیت ہو جائے گی تو ان کو اس حقیقت میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہوگی ۔ اور ہماری تدریس کا ایک ایسا مقصد حاصل ہو جائے گا جس کا اثر اُردو زبان کی ترقی پر نہایت خوشگوار ہوگا ۔

توگویا اسکولوں میں زبان اُردو کی تعلیم کے مقاصد حسب ذیل ہیں :-

(۱) طلبہ کے قلوب میں اُردو زبان کی محبت پیدا کرنا ۔

(۲) طلبہ کی تحریری اور تقریری زبان میں سلاست صحت اور صفائی پیدا کرنا ۔

(۳) طلبہ میں مطالعے کی عادت ڈالنا اور اُن کو مطالعے کے طریقوں سے واقف کرنا ۔

(۴) طلبہ میں ادبیات سے شغف پیدا کرنا ۔

(۵) طلبہ کو تخلیق ادب پر آمادہ کرنا ۔

(۶) طلبہ کو اُردو کے تاریخی و لسانی مسائل سے آگاہ کرنا ۔

(۷) طلبہ میں یہ احساس پیدا کرنا کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے ۔

اساتذہ کو چاہیئے کہ اپنی تدریس کے دوران میں ان مقاصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں ۔ اگر اُن کے سامنے اس قسم کا کوئی نصب العین نہیں ہے اور محض کتاب کا پڑھا دینا ہی وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں تو اُن کی تدریس ایک بے معنی اور فضول چیز ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے بہت ہمت و استقلال کی ضرورت ہے ، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کام کے لئے اساتذہ کو کم از کم پانچ چھ برس کا زمانہ ملتا ہے اور یہ مدت بہت کافی ہوتی ہے ۔ اگر وہ محنت اور توجہ سے کام کریں اور اپنے کام میں دلچسپی بھی لیں تو یقیناً کامیاب ہو سکتے ہیں ۔

آئندہ ابواب میں جو کچھ لکھا جائے گا وہ حقیقت میں ان مقاصد کے حصول کے ذرائع ہوں گے ۔ کوشش کی جائے گی کہ اُن تمام تدابیر کا تفصیلی ذکر کیا جائے جو اس سلسلے میں اختیار کی جا سکتی ہیں ۔ لیکن یہ امر بہرحال واضح رہنا چاہیئے کہ مختلف طلبہ کی مختلف ضروریات ہوتی ہیں

اور اسی باعث تعلیم کے مختلف طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ تمام ہندوستان کے طلبہ کے لئے ایک ہی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اساتذہ تدریس کے صحیح اصولوں کو بنیاد بنا کر اپنے طریقوں کو مقامی اور وقتی ضروریات کے مطابق تعمیر کریں۔

میرا ہیرو

میری عمر تیرہ چودہ برس کی تھی۔ اپنے ہمعصروں کی طرح میں بھی اپنے وقت کا اکثر حصہ کھیل کود میں صرف کرتا تھا۔ زندگی اور زندہ دلی مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میرا دن بھر کا کام کیا تھا؟ خوب شرارتیں کرنا۔ چھوٹوں کو تنگ کرنا۔ بڑوں کا منہ چڑانا اور استادوں کو دق کرنا۔ لیکن ساتھ ہی میرے کچھ خیالات بھی تھے۔ خاص خیالات۔

سائنس اور ریاضی جیسے خشک مضامین سے مجھے نفرت تھی۔ صرف و نحو اور ڈرائنگ کو میں حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ میں کہا کرتا تھا کہ آخر ان مضامین سے انسانوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بس مجھے تاریخ سے دلچسپی تھی اور خاص کر اپنے ملک کی تاریخ سے۔ میں بہادر اور شیر دل ترکوں پٹھان شاہسواروں اور عرب تیغ زنوں کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ یہ لوگ بہادر تھے اور شجاع۔ میں ان لوگوں کی پرستش کرتا تھا۔ یہی میری توجہ جذب کر سکتے تھے۔

اکثر اوقات میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ بجائے ہلکی پھلکی چپاتیوں اور نفیس سالن کے میرے لئے موٹی موٹی روٹی اور خراب سا سالن ہوا کرتا۔ بعض دفعہ میں اپنے کپڑوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا کیونکہ یہ فوجی لباس سے بالکل مختلف ہوتے تھے۔ مجھے سوداگروں ڈاکٹروں، انجنیروں اور پروفیسروں وغیرہ سے سخت نفرت تھی۔ میری ایک آرزو تھی صرف ایک اور وہ یہ کہ میں بھی ہیرو بن جاؤں۔

ہیرو کا مطلب کیا ہے یہ میں خود بھی اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ لیکن اتنا میں ضرور سمجھتا تھا کہ ہیرو وہ ہوتا ہے جو مایوس کن حالات میں فتح حاصل کرلے۔ جو اپنے ملکی علم کو بچانے کے لئے خود اپنے جہاز کو بارود سے اڑا دے۔ جو تلواروں کے زخم اور بندوق کی گولیاں کھا کر اپنی جان دیدے مگر یہ سب زخم اس کے سینہ پر ہوں پشت پر نہ ہوں۔ مختصر یہ کہ ہیرو کا مطلب کچھ پیچیدہ سا تھا۔

میری خواہش یہ تھی کہ میں خود ہیرو بنوں لیکن چونکہ میں ابھی چھوٹا تھا اس لئے یہ ممتاز درجہ حاصل نہیں کر سکتا تھا اس لئے میں چاہتا تھا کہ کم از کم کسی ہیرو کو دیکھ لوں اور اُسے اچھی طرح سے جان لوں۔ میں نے اس کی تلاش شروع کر دی اور آخر کار اُسے پا لیا۔ میرا ہیرو ایک اجنبی تھا جو کسی زمانے میں فوج میں سپاہی رہ چکا تھا اور اس کے چہرہ پر ایک زخم بھی تھا۔

اس ایک بیرونی اور ظاہری نشان سے میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ ضرور بہادر اور شجاع ہے۔ نہ جانے اس کے جسم پر اور کتنے زخم ہوں گے۔

بہر حال اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ ہیرو ہوتے ضرور ہیں۔ میرے ہیرو میں ایک کمی یہ تھی کہ اس کے دونوں بازو صحیح و سالم تھے اور اس کی کوئی ٹانگ لکڑی کی نہیں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان میں سے کوئی بات ہوتی۔ لیکن میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ ضرور اس کا سارا جسم زخموں کی وجہ سے چھلنی ہو گا۔

میں اپنے ہیرو سے یہ پوچھنے کا کوئی موقعہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ وہ کیسے اور کہاں زخمی ہوا تھا کہ ہماری باورچن نے ایک عجیب سی بات کہہ دی جسے سن کر میں حیران رہ گیا۔

ایک دن ہماری باورچن نے اُس سے پوچھا "کیوں میاں غفور خاں تمہارے چہرے پر جو زخم ہے وہ کس لڑائی میں لگا تھا۔

اس نے جواب دیا" لڑائی میں؟ اب لڑائیاں کہاں؟ جب میں فوج کی ملازمت سے الگ ہونے والا تھا تو ایک دن اپنے ساتھی سے لڑ پڑا۔ وہ نشہ میں تھا۔ اس نے میرے چہرے پر بندوق کا دستہ مارا جس کی وجہ سے میں زخمی ہو گیا۔

جب میں نے یہ بات سنی تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے سمجھ لیا کہ دنیا میں زندہ ہیرو کوئی نہیں ہے۔

اب اس کے سوا اور چارہ کیا تھا کہ میں خود ہیرو بنوں۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ میں زمانۂ قدیم کے کس ہیرو کے نقشِ قدم پر چلوں اس کو اپنا رہبر و راستا دبناؤں۔ اگرچہ ایسے ہیرو

بہت سے تھے مگر میں ایک خاص ہیرو چاہتا تھا۔ میں نے سوچا ایسا ہیرو کہاں سے تلاش کروں۔

ہمارے قبیلے کا صفدر خاں بھی ہیرو تھا۔ اس نے اپنی لاٹھی سے کئی ڈاکوؤں کے سر توڑ دئے تھے اور انھیں مار بھگایا تھا لیکن میں نے یہ کہیں نہیں پڑھا تھا اور نہ سنا تھا کہ اس کے جسم پر زخم بھی تھے۔ میرے نزدیک زخموں کا ہونا ضروری تھا۔

ارلینڈ بھی ہیرو تھا لیکن اس کے متعلق میں بہت کم جانتا تھا اور اس کے علاوہ وہ ہندوستانی بھی نہیں تھا۔

سلطان صلاح الدین، انور پاشا، محمود غزنوی، نپولین۔ لیکن زخموں کے متعلق کیا معلوم علاوہ ازیں ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ ہیرو ہیں۔ ہر شخص انھیں جانتا ہے۔ میں اپنے لئے ایک خاص ہیرو چاہتا تھا جس کی پرستش تنہا میں کر سکوں۔

میری جستجو ناکام نہیں رہی اور میں نے اپنا ہیرو عجیب وغریب طریقے سے پایا۔

ہمارے قصبے سے ذرا باہر ایک قدیم مقبرہ ہے اس کے پاس کسی ضرورت کے لئے کھدائی کا کام شروع ہوا۔ کھودنے میں پرانی پرانی ہڈیاں اور بعض اوقات سروں کے ڈھانچے نکلتے تھے ہمارے مدرسے کے بہت سے لڑکے وہاں جاتے اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ بھی زمین کھودنا شروع کر دیتے تھے۔ اس خیال سے کہ شاید زمانۂ قدیم کا کوئی سکہ یا اسی قسم کی کوئی چیز انھیں مل جائے ہمیں اس کام سے اس قدر دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کہ چھٹی ہوتے ہی ہم وہاں پہنچ جاتے اور کافی دیر تک ٹھہرے رہتے تھے۔ مگر جب کئی دن تک کوئی چیز نہیں ملی تو لڑکوں نے وہاں جانا ترک کر دیا۔ لیکن میں برابر ڈٹا رہا۔ میرا ایمان تھا کہ مجھے ضرور کوئی نہ کوئی چیز مل جائے گی۔ میری قسمت میرے ساتھ تھی۔

ایک جگہ میں نے مٹی کا رنگ کچھ بدلا ہوا دیکھا۔ ہر جگہ مٹی کا رنگ سیاہ تھا لیکن یہاں اس سیاہی میں کچھ زردی نظر آتی تھی۔ میں نے زمین کھودنا شروع کی اور تھوڑی دیر کے بعد ایک چیز پالی۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ یہ چیز کیا تھی۔ ایک کارتوس تھا۔ میں نے تھوڑی سی مٹی اور ہٹائی

مجھے چھ کارتوس اور ملے ۔ ایک تانبے کی لوح بھی جس پر گرد و غبار جما ہوا تھا ۔
کارتوس ؟ ـــــ مجھے میرا ہیرو مل گیا تھا ۔
بڑے احترام سے میں نے ادھر اُدھر جو ہڈیاں پڑی تھیں انھیں اٹھایا اور سب چیزوں کو اپنے بستہ میں ڈال لیا ۔
آخر میں نے اپنے ہیرو کو پا ہی لیا ۔ اصلی ہیرو ۔
جب میں گھر پہنچا تو اس خزانے کو اپنے چھوٹے سے ڈبہ میں بند کر کے قفل لگا دیا اور کنجی اپنی جیب میں ڈال لی ۔
کھانے کے وقت میں نے فاتحانہ انداز میں ادھر اُدھر نظر ڈالی ۔ اپنے بھائیوں اور بہنوں کو حقیر سمجھنے لگا ۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ میرے پاس ایک بیش بہا خزانہ ہے ۔ انھیں کیا خبر تھی کہ میرے پاس ایک ہیرو کی نشانیاں ہیں ، بالکل اصلی نشانیاں ۔ خوشی کے مارے میں کھانا بہت کم کھا رہا تھا یہ دیکھ اماں جان نے مجھ سے پوچھا "جمیل کیا بات ہے تم کھانا بہت کم کھا رہے ہو ؟"
میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کچھ جواب دیا اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں خوب کھا رہا ہوں ایک سالم آلو منہ میں رکھ لیا ۔
جونہی کھانا ختم ہوا میں کمرے میں پہنچا ۔ ڈبہ میں ہڈیاں ، کارتوس ، لوح سب چیزیں موجود تھیں میں نے انھیں اپنی آنکھوں سے لگایا ۔
اس شام کو میری طبیعت بالکل بدل گئی ۔ میں اپنی چھوٹی بہن سے خوب کھیلا اور اُسے بالکل تنگ نہیں کیا ۔ اماں جان اور ابا جان نے جو کام کرنے کو کہا اُسے اچھی طرح سے کیا ۔
رات کو میں پھر کمرے میں پہنچا اور ان چیزوں کو نکال کر دیکھنا شروع کیا ۔ ہڈیوں کا رنگ بھورا تھا ۔ کارتوس نیلے تھے اور تانبے کی لوح پر خوب گرد و غبار تھا ۔ معلوم ہوتا تھا اس پر کوئی نام لکھا ہے ۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنے ہیرو کا نام معلوم کروں جس نے یکے بعد دیگرے چھ گولیاں کھائی تھیں مگر یہ پڑھا نہیں جاتا تھا ۔ آخر کار ان سب چیزوں کو ڈبہ میں رکھ کر مقفل کر دیا ۔ مجھے رات بھر

نیند نہ آسکی۔ طرح طرح کے خیالات میرے دل میں آتے رہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے اس راز کو کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔ کسی راز کو سینہ میں پوشیدہ رکھنا بڑی مسرت کی بات ہے اور پھر ایسا راز۔

میں دن بھر سوچتا رہتا تھا کہ میرا ہیرو کون ہے؟ کس جنگ میں وہ شامل ہوا اور کس جگہ اپنے ملک کے لئے اس نے جان دیدی۔ یہ بات بالکل صاف تھی کہ اس نے سات گولیاں تو ضرور کھائی ہیں۔ لیکن کیا فقط سات گولیوں نے اس کا خاتمہ کر دیا یقیناً وہ اور زخموں سے شہید ہوا ہوگا۔ تلوار کے زخموں سے، نیزوں سے، بھالوں سے، ـــ اس کے بعد میں نے اس کی ایک خیالی سوانحعمری تیار کر لی اور اس سے میں مطمئن بھی ہو گیا۔

اس کی زندگی کے مختصر حالات یہ تھے کہ میرا ہیرو ٹیپو سلطان کی فوج کا ایک سپاہی تھا۔ اپنی بہادری اور شجاعت سے وہ ایک اعلیٰ عہدے پر پہنچ گیا تھا۔ تمام لڑائیوں میں وہ اتنی دلیری سے لڑا کہ اس کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ ایک مرتبہ محض اس کی فوجی قابلیت سے دشمنوں کو شکست ہوئی۔ میسور کی آخری جنگ میں وہ اتنی بہادری اتنی جرأت سے لڑا کہ دشمنوں کے دانت کھٹے کر دئے۔ وہ مخالف فوج میں گھس گیا اور کئی دشمنوں کو مار ڈالا۔ اس کی شمشیر کی دھوم تمام دشمنوں میں پھیل گئی۔ مگر تنہا کب تک لڑتا۔ وہ زخموں سے چور ہو گیا تھا لیکن اس پر بھی دشمنوں کے پنجے سے صاف نکل آیا۔ جب اُسے جینے کی کچھ امید نہ رہی تو اس نے درخواست کی کہ اسے اس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ اس کی یہ درخواست منظور کر لی گئی لیکن اپنے گھر پہنچ کر وہ اللہ میاں کو پیارا ہو گیا۔ اس کا جنازہ بڑی دھوم اور شان و شوکت سے اٹھایا گیا۔ ہزارہا لوگوں نے شرکت کی۔ اور اُسے ایک جگہ دوسروں سے بالکل الگ دفن کر دیا گیا۔

لیکن میں نے اپنے دل میں سوال کیا کہ آخر اس کی قبر پر کوئی مقبرہ تعمیر کیوں نہیں کیا گیا، ہمارے قصبے میں کئی چھوٹے چھوٹے مقبرے تھے۔ کیا ان کے نیچے سونے والے میرے ہیرو سے زیادہ شجاع اور بہادر تھے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میرے ہیرو نے مرتے وقت وصیت کر دی تھی کہ اس کی قبر پر کوئی مقبرہ تعمیر نہ کیا جائے۔ تغیر زمانے سے بیچارے کی قبر کا نشان بھی

مٹ گیا۔ دنیا نے اُسے فراموش کر دیا تھا۔

اس بات نے مجھے بیحد رنجیدہ کیا مجھے کسی کا یہ قول یاد آگیا کہ "احسان فراموشی ہی اس دنیا کا انعام ہے"۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے نام اور یاد کو تازہ کر دوں گا۔ میں کتابوں میں اس کے حالات کو دیکھوں گا۔ قلمی نسخوں میں اس کے نام کو معلوم کر دوں گا۔ اور آخر کار دنیا کو بتا دوں گا کہ میرا ہیرو کس قدر زبردست شخصیت کا مالک تھا۔ لوگ اس انکشاف سے دنگ رہ جائیں گے۔

تصور ہی میں میں نے اس کے کردار کے متعلق طرح طرح کی رائیں قائم کر لیں۔ بہادری اور شجاعت میں لاثانی۔ بیکس خواتین کا حامی۔ بوڑھوں اور یتیموں کا غم خوار۔ پناہ گزینوں کا مددگار اور سرکشوں کے لئے قہر کی تلوار، مجھے اپنے ہیرو پر بہت فخر و ناز تھا مجھے یقین ہو گیا کہ اور سب ہیرو بہت گھٹیا درجہ کے مالک تھے۔

اب میں لڑکا نہیں تھا، آدمی بھی نہیں بلکہ ایک بڑا آدمی تھا۔ میرے سامنے ایک عظیم الشان کام تھا۔ اپنے ہیرو کا نام روشن کرنا۔ میں نے تمام کھیل چھوڑ دئے۔ کنکوے بازی سے مجھے نفرت ہو گئی۔ گولیاں کھیلنا میں نے ترک کر دیا۔ آوارہ گردی ختم ہو گئی۔ دوسرے لڑکوں کو میں حقارت سے دیکھنے لگا۔

یہ حالت چند دنوں تک قائم رہی۔ آخر میں نے محسوس کیا کہ اس راز کو صرف اپنے تک محدود رکھ کر کچھ زیادہ مسرت نہیں ہوتی۔ خوش قسمتی سے میرے دو نہایت پیارے اور گہرے دوست تھے۔ توقیر اور علیم۔

میں نے سوچا۔ اس راز میں ان کو بھی شامل کر لوں۔ سب سے پہلے میں نے ان سے قسم لی کہ وہ اس راز کو کسی اور پر ظاہر نہیں کریں گے۔ پھر میں نے اپنے ہیرو کی زندگی کے حالات انھیں سنائے۔ وہ بہت غور اور دلچسپی سے سنتے رہے جب میں ختم کر چکا تو علیم نے مجھ سے پوچھا "جمیل لیکن ہیرو کا نام کیا ہے"؟

میں خاموش ہو گیا کیونکہ میں نے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ میرا

مذاق نہ اڑائیں، میں نے ان سے کہدیا" سکندر پاشا"
اور انھوں نے فوراً یقین کر لیا۔

اس کے بعد تو سکندر پاشا کے ذکر کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں تھا۔ ہم جب آہستہ آہستہ اس کے متعلق باتیں کرتے تو لڑکوں کو تعجب ہوتا کہ یہ تینوں کیا کر رہے ہیں۔ تاریخ کے گھنٹے میں جب ہمارا استاد مختلف سپہ سالاروں اور بہادروں کا ذکر کرتا تو ہم مسکراتے اور ایک دوسرے کے کان میں کہتے" بیچارے کو سکندر پاشا کا پتہ نہیں۔ اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ اگر وہ چند سال اور زندہ رہتا تو ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ بدل جاتا، ہم بہت احتیاط کرتے کہ ہمارا راز کوئی دوسرا معلوم نہ کرلے۔

اگرچہ میں" ہمارا" راز کہتا ہوں مگر در اصل یہ"میرا" راز تھا۔ کیونکہ میں نے توقیر اور علیم سے ہڈیوں، کارتوسوں اور تانبے کی لوح کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ صرف نصف راز جانتے تھے۔

گھر پر میری حالت بالکل بدل گئی تھی۔ میں اکثر اپنے کمرے میں گھنٹوں بند رہتا۔ میرا بہت سا وقت غور و فکر میں گذر جاتا۔ لیکن اس بات کا خدشہ بھی ہمیشہ رہتا تھا کہ میرا راز کوئی معلوم نہ کرلے۔

ایک دن میں ابا جان کے ساتھ سیر کرنے گیا۔ راستے میں مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہیں، یکایک ابا جان نے مجھ سے پوچھا" کیا وہ کھدائی ختم ہو گئی ہے۔ میں وہاں کئی دن سے نہیں گیا۔ تم تو اکثر جاتے رہتے ہو۔ کیا تمھیں کام کی کوئی چیز بھی ملی یا نہیں"

کیا ابا جان کو مجھ پر کچھ شبہ تھا۔ میں نے جواب دیا" میں تو وہاں گذشتہ ہفتہ سے نہیں گیا"
یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ کیونکہ گذشتہ ہفتہ میں مجھے میرا ہیرو مل گیا تھا۔

ابا جان نے مسکرا کر کہا" میں سمجھا تھا تم نے کوئی خزانہ پالیا ہے۔ کیونکہ تمھاری حالت کچھ بدل سی گئی ہے کیا سارا خزانہ اپنے لئے ہی وقف کر لوگے"

"نہیں" میں نے جواب دیا" مجھے تو کوئی خزانہ نہیں ملا"

والد صاحب قبلہ نے موضوع بدل دیا اور مجھ سے پوچھا کہ میں نے اپنے بڑے بھائی کی

شادی کے موقعہ پر کسی تحفہ کا انتخاب بھی کیا ہے یا نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے کبھی اس کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ میری تمام توجہ میرے ہیرو نے جذب کر رکھی تھی۔ فوراً ہی میرے دل میں ایک خیال آیا۔ بہت ہی اچھا خیال۔ شادی کے موقعہ پر بھائی جان کے لئے ہیرو سے بڑھ کر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔

میں نے جواب دیا "ابا جان میں نے ایک نہایت ہی عمدہ تحفہ منتخب کیا ہے۔"

"بہت خوب" انھوں نے میری پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

مجھے چونکہ اپنے ہیرو کے متعلق کچھ جاننے کا شوق تھا اس لئے میں نے پوچھا "ابا جان وہ جو قدیم مقبرہ ہے اس کے آس پاس کبھی لوگ دفن بھی ہوتے تھے۔"

"میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ آج سے پچاس برس پہلے کسی کو یہاں دفن کرتے تھے۔ مگر یہ قبرستان نہیں ہے۔ ممکن ہے زمانۂ قدیم میں اس کو اس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہوں۔"

"لیکن آپ کو کسی آدمی کا نام معلوم ہے جو یہاں دفن ہوا ہو۔"

انھوں نے جواب دیا "مجھے کچھ نہیں معلوم" پھر کچھ سوچ کر کہا "ہاں ایک آدمی ب۔س فرضی کا میں نے نام سنا ہے جو یہاں دفن ہوا تھا۔ لیکن اس کی صحیح قومیت کا پتہ کسی کو بھی نہیں معلوم۔"

کیا میرے ہیرو کا اعلیٰ نام یہی تھا۔ کون کہہ سکتا ہے۔ میں نے ذرا ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا ب۔س۔ فرضی کوئی ہیرو تھا۔"

"ہیرو؟ نہیں بالکل نہیں۔ بلکہ بالکل متضاد۔"

"بزدل۔ ڈرپوک۔"

"اس سے بھی زیادہ۔ فرضی ایک غدار تھا۔ جس نے اپنے ملک سے غداری کی تھی۔"

"خدا رحم کرے۔"

"ہاں۔ پہلے تو وہ دشمنوں کی حفاظت میں رہا۔ لیکن جب وہ چلے گئے تو لوگوں نے [illegible] کا محاصرہ کر لیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ اور مقبرہ کے پاس ہی دفن کر دیا۔

دفن کیا گیا یوں ہی پھینک کر مٹی ڈال دی ۔"

" غداری کا یہی انجام ہونا چاہیئے"، میں نے کہا۔

" میں نے یہ بھی سنا ہے" ابا جان نے کہا " کبھی کبھی یہاں ان بہادروں کو بھی دفن کیا جاتا تھا جن کے متعلق یہ ڈر ہوتا تھا کہ کہیں دشمن آکر ان کی بے حرمتی نہ کریں۔"

بہر حال ان باتوں سے بھی کچھ زیادہ پتہ نہیں چل سکا۔ صرف یہ معلوم ہوا کہ مقبرے کے پاس کوئی غدار بھی دفن ہے۔ میں نے اپنے ہیرو اور اس غدار کا مقابلہ شروع کیا۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک دنیا کی نظروں میں اعلیٰ اور دوسرا اسفل

جب میں گھر پہنچا تو فوراً اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا تاکہ اپنے ہیرو کی نشانیوں کو پھر اپنی نظروں سے دیکھوں۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے اپنی جیب کو ٹٹولا۔ کنجی میری جیب میں نہیں تھی مجھے یقین تھا کہ یہ مجھ سے کھوئی ہرگز نہیں۔ شاید اسے میں اپنے ڈبے کے تالے ہی میں چھوڑ گیا ہوں کیا عجب کہ میرا راز ظاہر ہو گیا ہو۔

میں کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔ جلدی جلدی کمرے میں داخل ہوا۔ میری چھوٹی بہن کھلے ڈبے کے پاس کھڑی تھی۔

" بدتمیز لڑکی" میں نے چلا کر کہا " تم میری چیزوں سے کیا کر رہی ہو۔ چلی جاؤ"

" لیکن بھائی جان" اس نے جواب دیا " تالے کے ساتھ کنجی تھی۔ میں نے ڈبہ کھول لیا یہ دیکھنے کے لئے کہ اس میں کیا ہے۔"

" ہاں عورتوں کی یہ عادت ہوتی ہے۔ دوسروں کی چیزیں دیکھنے کا انھیں بہت شوق رہتا ہے۔"

" بھائی جان خفا مت ہوجئے۔ میں نے کوئی چیز چرائی تو ہے نہیں۔ اس تانبے کی لوح پر بہت گرد و غبار جم رہا تھا۔ میں اس کو صاف کر رہی تھی۔ اب یہ بالکل صاف ہو گئی ہے۔ دیکھئے اس پر کچھ لکھا بھی ہے۔"

یہ کہتے ہی اُس نے وہ لوح میرے ہاتھوں میں دیدی ۔

معلوم ہوتا تھا کمرے کی دیواریں اور دروازے میرے سامنے گھوم رہے ہیں ۔ ہر ایک چیز سیاہ معلوم ہوتی تھی ۔ تانبے کی لوح پر جو نام لکھا تھا میں اُسے پڑھ رہا تھا ۔

ب ۔ س ۔ فرضی

۱۹۳۰ء

میرے ہاتھوں سے لوح گر گئی ۔ میں نے ہڈیاں اور کارتوس ڈبے سے نکالے اور انھیں کھڑکی سے باہر پھینک دیا ۔

یہ انجام ہوا میرے ہیرو کا

دیہی صنعتیں اور دیہات کی نئی تعمیر

۱۔ ہندوستانی زندگی میں گاؤں کی اہمیت

ہندوستان کی ترقی کے جو آثار آج کل نظر آ رہے ہیں۔ اُن میں سب سے زیادہ امید افضا یہ چیز ہے کہ لوگوں نے اب دیہاتی زندگی کے متعلق غور و فکر کرنا شروع کر دیا ہے۔ مغربی اثر میں آنے کے بعد ہم نے یہ بات بھلا دی تھی کہ ہندوستان ایک دیہی ملک ہے۔ شہروں میں ہم نے مغربی انداز کی تعلیم حاصل کی اور یہ سوچا کہ اپنے ملک کو جدید ملکوں کے دوش بدوش لانے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کی تقلید میں شہری حالات کو تمام ملک میں پیدا کیا اور پھیلایا جائے۔ لیکن اب خیالات میں تبدیلی ہو رہی ہے اور ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ ہماری نجات من حیث القوم دیہی اصلاح کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

کانگریس اور رائے عامہ کیوں اب دیہی اصلاح کی طرف متوجہ ہو رہی ہے اس کا سبب دریافت کرنا مشکل نہیں ہے۔ یہ بات اب ہر خاص و عام کی زبان پر ہے کہ ہندوستان ایک دیہاتی ملک ہے یہاں کی نوے فیصدی آبادی دیہاتی ہے اور ۷۰ فیصدی سے زیادہ اشیاء خام پیدا کرتی ہے۔ اس لئے جس کسی جماعت کے پیش نظر ملک کی مادی اور اخلاقی فلاح و بہبود ہے اُسے مجبورًا دیہات کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا اصل ہندوستان صرف گاؤں ہی میں نظر آسکتا ہے۔ یہ بجائے خود معقول دلیل ہے۔ پھر اس کے علاوہ ایک اور بہتر دلیل بھی موجود ہے۔ ہماری تہذیب اور مغربی تہذیب میں بڑا فرق یہ ہے کہ ہماری تہذیب کی جڑ دیہاتی زندگی میں پیوست ہے اور مغربی تہذیب نے شہروں کی گود میں ہوش سنبھالا ہے اور وہیں پل کر جوان ہوئی ہے۔ قدیم یونان کے جمہوری دور میں شہروں کا ہی راگ گایا جاتا تھا۔ یورپ کے عہد متوسط میں طرز زندگی

کا تعین ایسے شاہی درباروں میں ہوتا تھا جو شہر میں واقع تھے۔ درباری زندگی کی خصوصیات آہستہ آہستہ جاگیرداروں تک پہنچی تھیں جاگیرداروں سے زمینداروں تک اور زمینداروں سے کاشتکاروں تک۔ اسی طرح آج بھی یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ مغربی تہذیب فی الحقیقت شہری تہذیب ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ کثیر تعداد میں صنعتی مرکزوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ان شہروں میں بڑے پیمانے پر دولت پیدا کی جاتی ہے اور لوگ ایک یکساں سانچے میں ڈھال دیئے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسا کبھی نہیں ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے یہاں ایسے شہنشاہ تھے جو شہروں میں شان و شوکت سے رہتے تھے لیکن پھر بھی دیہات کی آزادی کبھی ختم نہیں ہوئی شہنشاہ صرف حملہ کے وقت لوگوں کی مدافعت کرتا تھا اور صنعت و حرفت اور تمدن و تہذیب کا مربی اور سرپرست ہوتا تھا۔ دیہی زندگی کے نصب العین اور زندگی کی سادگی کی عزت ہر شخص کے دل میں موجود تھی اور کھیتی کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے تمدن کو اسی وقت بہترین طریقے پر سمجھا جا سکتا ہے جب اس زرعی ماحول کو سمجھ لیا جائے۔ جس میں کہ وہ پیدا ہوا ہے۔ بنابریں مغرب کی (جس کی ترقی کے اسباب ہم سے بنیادی طور پر مختلف ہیں) محض تقلید کرنا ہمارے قومی ترکہ کے لئے ہرگز موزوں اور مناسب نہیں ہے۔

پس اگر گاؤں کو ہمارے خیالات میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کرنی ہی ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن اصولوں کو دریافت کیا جائے جن پر ہماری دیہاتی زندگی کی فی الواقعی بنیاد قائم کی گئی تھی کیونکہ نئی عمارت کے دوبارہ بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم موجودہ بنیادوں پر اپنی تعمیر شروع کریں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ان بنیادوں کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے زمانہ کی ہزاروں تباہ کاریوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ لازمی ہے کہ ابتدائی معماروں کے نقشوں کا مطالعہ کریں کیونکہ اگر ہم اُن کی تصریحات کی پوری پیروی نہ کریں گے تو ہماری عمارت بیٹھ جائے گی۔ یا استعارہ بدل کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر نئے اعضاء کو پرانے جسم پر محض تھوپنا منظور نہیں ہے، تو یہ ضروری ہے کہ ان میں اور پرانے جسم میں عضوی اتحاد پیدا

کیا جائے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پُرانے اعضا کو ہی دوبارہ جسم سے جوڑ دیا جائے کیونکہ کوئی زندہ جسم اپنی زندگی کے مختلف مدارج میں بالکل یکساں نہیں رہ سکتا۔ یہ بدلتا رہتا ہے جب حالات مختلف ہو جاتے ہیں تو ان سے مطابقت کی کوشش کرتا ہے اور یونہی اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ گاؤں کو ترقی دینے کی کوشش میں ہم اپنی کاہلی اور سہل انگاری سے ماضی کی طرف واپس نہیں جا سکتے اور نہ اُس کی غلامانہ تقلید کر سکتے ہیں۔ ہماری جڑیں بے شک ماضی میں پیوست ہوں گی اور یوں ہمارے خیالوں اور کاموں کا اصل اصول وہی ہوگا جو ماضی کی دیہاتی تنظیم میں پایا جاتا تھا۔ لیکن اس کا اظہار اُن مختلف حالات کی بنا پر جو اس وقت پائے جاتے ہیں مختلف ہوگا کیونکہ زندگی ورثہ اور ماحول دونوں سے مل کر بنتی ہے۔

بنا بریں اپنی قومی زندگی کو از سرِ نو بنانے کی کوشش کرتے وقت یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم اُن بنیادی خیالوں کا صحیح اندازہ کریں جن پر ہماری دیہاتی زندگی اور تنظیم قائم ہے یہ خیالات جہاں تک سمجھ میں آتے ہیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جماعت کے ہر رکن کے لئے کم سے کم ناگزیر اسباب حیات یقینی طور پر فراہم کرنا۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کام کرنے والوں کو معاوضہ جنس کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ اور اس طرح اُن کی ضرورت کی تمام اشیاء انھیں غذا کی شکل میں مل جاتی تھی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ایسے نظام میں کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا۔ مشترکہ خاندان ایک دوسرا طریقہ تھا جو اسی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ اور اس سے دولت کی تقسیم میں بھی بہت زیادہ عدم مساوات پیدا نہ ہو سکتی تھی۔

۲۔ مقابلہ اور جلب منفعت کی مطلق العنان خواہش کو قابو میں رکھنا اور اس کی جگہ امداد باہمی کو ترقی دینا۔

ذات پات کے نظام کے ذریعے سے جماعت کا کام اُس کے مختلف ارکان میں تقسیم ہو جاتا تھا اور انھیں اپنا اپنا کام کرنا ہوتا تھا اس سے اس بات کی حفاظت ہو جاتی تھی کہ اگر کسی خاص

تجارت میں نفع زیادہ ہوتا تھا تو ہر شخص دوسروں سے مقابلہ کرنے کے لئے اُسی طرف نہیں لپکتا تھا اور اس کوشش میں جماعتی توازن کو آج کل کی طرح نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ مثلاً جب قانون کے پیشے میں آمدنی زیادہ ہوتی ہے تو ہر شخص وکیل بننے کی کوشش کرتا ہے اور اس بات کا خیال ترک کر دیتا ہے کہ جماعت کو کتنے وکیلوں کی ضرورت ہے۔ ذات کے نظام سے جماعتی وفاداری اور امداد باہمی بھی پیدا ہوتی تھی جس کی کمی اُن لوگوں میں جنھوں نے شہر میں تربیت پائی ہے بہت نمایاں ہے۔

۳۔ گاؤں کی زندگی کو اپنی جگہ مکمل بنانا تاکہ ہر گاؤں اپنی ضروریات کے مطابق کافی مقدار میں اشیاء پیدا کر سکے اور اپنی ابتدائی ضروریات کے لئے باہر کا محتاج نہ رہے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مختلف تجارتوں اور پیشوں کے کاموں میں ہم آہنگی پیدا ہوجاتی تھی اور لوگ خارجی حکومتوں کے ناجائز انتفاع اور ان پر انحصار کرنے سے محفوظ ہوجاتے تھے۔ طرز حکومت کے اعتبار سے بھی گاؤں اپنی جگہ پر مکمل ہوتا تھا۔ اس کے معاملات کا فیصلہ پنچایت کرتی تھی۔ اسی طرح ہر گاؤں ایک جمہوریت ہوتی تھی جس کی صدارت کا کام پنچایت کے سپرد ہوتا تھا۔ جو اس بات کا خیال رکھتی تھی کہ دیہاتی زندگی کے تمام شعبے مناسب طور پر کام کریں۔

۴۔ روحانی باتوں کا مرتبہ ارفع و بلند تھا۔

یہ اسی بات سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی اعلیٰ ترین ذات راجہ یا تاجر کی نہیں ہے بلکہ پروہت اور پنڈت کی ہے۔ راجہ چاہے کتنا ہی امیر اور طاقتور کیوں نہ ہو وہ ایک آوارہ گرد مفلس مہاتما کی عزت کرتا تھا۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ محض دولت کمانے کی بہت زیادہ قدر نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس ترک دنیا کو انسانی ترقی کی بلند ترین منزل سمجھا جاتا تھا۔

ان نصب العینوں کے مقابلے میں مغربی تہذیب کی بنیاد جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے دنیاوی زندگی تھی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کی سادگی کی جگہ مقبوضات کی کثرت کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے جس آدمی کے پاس دولت ہے اُس کی عزت کی جاتی ہے اور اُسے بادشاہ کی طرف سے طبقہ امرا میں جگہ مل جاتی ہے۔ علاوہ ازیں مغرب میں معاشی تنظیم کی بنیاد سخت اور بے درد مقابلے

پر رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے کمزور پست و ذلیل ہو جاتے ہیں اور طاقت ور کمزوروں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور زیادہ طاقتور بن جاتے ہیں پھر معاشی ترقی کی کوئی پہلے سے سوچی ہوئی اسکیم یا منصوبہ نہیں ہے جس کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ طلب کا لحاظ کئے بغیر ہوتا رہتا ہے۔ تقسیم کو رسد سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی اور تمام معاشی نظام میں ایک بے ترتیبی نظر آتی ہے۔ حرص و طمع کی علمداری ہے۔ منڈیوں اور اشیاء خام حاصل کرنے کے لئے دوسرے کا گلا گھونٹ کر اپنے لئے راستہ صاف کیا جاتا ہے اور تمام اخلاقی اور انسانی خیالات کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ مغربی اقوام جس مصیبت سے اس وقت دوچار ہیں اُس سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہئے، اور اُن کی اندھا دھند تقلید نہ کرنی چاہئے۔ لیکن ہمارے معاشی مسائل کے حل کرنے میں مغرب جو حصہ لے سکتا ہے اس کو لائق اعتنا نہ سمجھنے اور اپنی دینی تنظیم کے بنیادی خیالات کے مطابق تعمیر جدید کے کام کی ابتدا کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم مختصر طور پر اُن معاشی نظاموں کی تحقیقات کریں جو اس وقت دنیا میں برسر اقتدار نظر آتے ہیں تاکہ ہم بذات خود اس بات کا فیصلہ کرسکیں کہ اپنے گھر کی حالت درست کرنے کے واسطے ہمارے لئے کونسا طریقہ اختیار کرنا سب سے زیادہ موزوں ہوگا۔

۲۔ دُنیا کے آج کل کے معاشی نظام

اس وقت معاشی زندگی کی جو دو اہم ترین شکلیں پائی جاتی ہیں۔ وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت ہیں۔ سرمایہ داری نظام یورپ میں جاگیردارانہ نظام کے جانشین کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ جاگیرداری نظام میں اقتدار جاگیرداروں کو حاصل تھا وہ مضبوط قلعوں میں رہتے تھے اور اپنی دولت اور قوت میں اضافہ کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً قرب و جوار کے چھوٹے چھوٹے گاؤں پر حملہ کرتے رہتے تھے کم حیثیت کاشتکار اور مزدور انھیں خراج ادا کرتے تھے اور اس کے بدلے میں اُن کے حملے سے محفوظ رہتے تھے۔ جاگیرداروں کی ذہنیت سوائے خود غرضانہ نفع طلبی کے اور کچھ نہ تھی جب مشین کے استعمال کی وجہ سے یورپ میں صنعتی انقلاب ہوا اور اس

وقت ہندوستان سے بڑے بڑے خزانے کھینچ کر یورپ چلے گئے اُن جاگیرداروں کی جگہ بڑے بڑے ساہوکار پیدا ہوگئے۔ جنھوں نے اپنے طور پر ایک ایسا نظام قائم کرلیا جو جاگیرداروں کے نظام سے بہت سی باتوں میں مشابہ تھا۔ اور یوں یہ ساہوکار بھی اسی طرح منافع کمانے لگے جیسے جاگیردار خراج کے ذریعے سے کماتے تھے۔ یہاں بھی ذہنیت خودغرضانہ نفع طلبی کی تھی اور طریقہ یہ تھا کہ مشین کے ذریعے سے جتنا ہوسکے نفع حاصل کیا جائے اور اخلاقی پابندیوں کی کوئی پروا نہ کی جائے۔ ایک واحد آدمی مشین کے ذریعے سے ہزاروں مزدوروں کی محنت کا نفع حاصل کرنے لگا۔ وہ اپنی جیبیں بھرتا رہا اور چونکہ مشین کا مالک وہی ہوتا تھا اُس کے مزدور بے بس ہوتے تھے۔ اور اُنھیں اُس کی حرص و آز کو بلا احتجاج کئے برداشت کرنا پڑتا تھا۔ سرمایہ داری نظام کی ایک سب سے بڑی خرابی ہے کہ یہ نہ صرف نفع طلبی کی ذہنیت اور اُس کی معرفت بدترین حرص اور خودغرضی کو ترقی دیتا ہے بلکہ مزدور سے دولت پیدا کرنے کے اوزار چھین کر اُس کی آزادی بھی چھین لیتا ہے۔ جب یہ ہوجاتا ہے تو سرمایہ کی فتح اور مزدور کی غلامی مکمل ہوجاتی ہے۔ اپنے قرب وجوار کے آدمیوں سے جو ناجائز فائدہ حاصل ہوتا ہے سرمایہ دار اسی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ سرمایہ دار اپنی حریص نگاہوں کو دنیا کے بعید ترین گوشوں تک لے جاتا ہے۔ کیونکہ اُسے اپنی مصنوعات کے لئے منڈیوں اور اپنے کارخانوں کے لئے خام اشیار کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ بڑی بڑی رقموں کے ساہوکار سے وہ ان جگہوں پر قبضہ کرتا ہے اور اس بات کا پورا انتظام کرتا ہے کہ یہاں کے رہنے والوں کی حیثیت لکڑہاروں اور پنہاروں جیسے ہوجائے۔ وہ اُنھیں اپنے ملک میں صنعتی اشیار پیدا کرنے سے باز رکھتا ہے کیونکہ ایسی حالت میں اُس کی منڈی اُس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ غرض کہ اس طرح نظام سرمایہ داری سے نظام شہنشاہیت پیدا ہوتا ہے۔ اور کمزور قوموں کو غلام کرکے اُن سے ناجائز فائدہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کاروبار میں یہ ظاہر ہے کہ اخلاقی پابندیوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا کیونکہ تجارت بہرحال تجارت ہے اور اُس میں جو چیز قابل لحاظ ہوتی ہے وہ صرف نفع ہوتا ہے۔ بنابریں۔

کوئی چیز ساہوکار کو اپنے گندے کام کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر کچھ روک ٹوک کی جاتی ہو۔ تو فورًا جنگ شروع ہو جاتی ہے اور ناقابل بیان کشت و خون اور تباہی پھیل جاتی ہے بسرمایہ دار کو اپنا سونا چاہئیے، چاہے اُس کی وجہ سے خون کی کتنی ہی ندیاں کیوں نہ بہہ جائیں۔ غریب مزدور کو جس نے مشین کا ایک حقیر پرزا بننے کے لئے پہلے اپنی آزادی کو قربان کیا تھا۔ اب اعلیٰ نصب العینوں کا نشہ دیا جاتا ہے اور اُسے قومی عزت کا محافظ اور وحشیوں کو مہذب بنانے والا کہہ کر اُبھارا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خوشی خوشی توپ کی غذا بن کر سرمایہ داروں کے حرص و آز کا شکار ہو جاتا ہے۔ سرمایہ داری کی جو تصویر اوپر کھینچی گئی ہے وہ بہت بھیانک نظر آتی ہے لیکن اگر سرمایہ داری سے اُس کا اوپری خول اوتار دیا جائے اور اُس کی بدنما عریانی کا مشاہدہ کیا جائے تو اس کے علاوہ اور نظر ہی کیا آسکتا ہے؟ سرمایہ داری کی جلو میں خود غرضی، ناجائز انتفاع، جنگ، تباہی اور خون ریزی کا آنا ناگزیر ہے۔

اشتراکیت ان بُرائیوں کے خلاف ایک کھلے ہوئے احتجاج کی شکل میں رونما ہوئی اس لئے قدرتی طور پر اس سے یہ توقع وابستہ کیجاتی ہے کہ یہ ہمارے سامنے نظام سرمایہ داری کا ایک ایسا نعم البدل پیش کرے گی جو ہماری قوم کے لئے نہایت ہی موزوں ہوگا۔ اشتراکیت نے اس بات کو سمجھ لیا کہ بیان کرتے کا چاہے جو طریقہ اختیار کیا جائے سرمایہ داری کی جڑ دراصل نفع طلبی اور خود غرضی ہے اور اُس نے اس سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ یہ بتایا کہ پیدائش دولت کو ایک اجتماعی شکل دے دی جائے جو چیز بھی پیدا کیجائے اگر اُس کی ملکیت جماعت کو حاصل ہو تو خود غرضی اور حرص کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ اشتراکیت نے نفع طلبی کی ذہنیت کو جڑ سے اکھاڑ کر یہ سمجھا کہ اُس نے تمام اُن برائیوں پر فتح پالی ہے جو سرمایہ داری میں پائی جاتی ہیں لیکن اس کا نتیجہ درحقیقت یہ ہوا کہ اگر سرمایہ داری ایک انتہا پر تھی تو اشتراکیت دوسری انتہا پر پہنچ گئی سرمایہ داری میں ہر فرد کو آزادی تھی استطاعت ہونے کی حالت میں ہر شخص کے لئے یہ ممکن تھا کہ ہر موقع سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے۔ خواہ اُس سے دوسروں کو کتنا ہی نقصان

کیوں نہ ہوتا ہو لیکن دوسروں کے نقصان کا انسداد کرنے کی کوشش میں اشتراکیت دوسری انتہا تک پہنچ گئی اور اُس نے سرے سے افراد کی ذاتی جدوجہد اور مساعی ہی کو یک قلم ختم کر دیا۔ جماعت سب کچھ ہوگئی اور فرد کو اس قدر دبایا گیا کہ وہ نظام سرمایہ داری کی طرح دوبارہ ایک بڑے پہیے کا حقیر پرزہ بن گیا۔ چند اشخاص تمام قوم کے لئے منصوبے بناتے ہیں اور بقیہ تمام لوگوں کے لئے اُن کے احکام بجالانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اشتراکیت پسند لوگ اس میں شک نہیں اس کی نہایت پرزور تردید کریں گے کیونکہ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ نظام اشتراکیت میں صرف چند آدمی جماعت کے کاموں کو نہیں چلاتے بلکہ مزدوروں کی جماعت کے لکھوکھا آدمی جلسہ مشاورت میں شریک ہوتے ہیں اور جو بات انھیں مطلوب ہوتی ہے اُس کی بابت فیصلہ کرتے ہیں لیکن اس کی تردید میں یہ کہا جا سکتا ہے اول تو لکھوکھا آدمی جب کوئی فیصلہ کرتے ہیں اُس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ چند با اقتدار آدمی جو چاہتے ہیں اُس کی موافقت میں محض رسمی طور پر رضامندی کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں تک پیدائش دولت کا تعلق ہے اشتراکیت میں ذاتی جدوجہد، قوت تخلیق اور شخصیت کے اظہار کا موقع بالکل باقی نہیں رہا ہے۔ اور اُن چیزوں کی عدم موجودگی میں اشیا کی تعداد میں اشتراکیت کی وجہ سے جو اضافہ ہوتا ہے اُس کی پوری قدر و منزلت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ انسان جس چیز کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ درحقیقت اُس کی انفرادیت ہے۔ یعنی اس بات کی آزادی کہ جس طرح چاہے سوچے اور عمل کرے اور تخلیقی کام انجام دے لیکن اگر ایک آدمی کو ایک مقررہ نمونے کے مطابق کام کرنا پڑے تو وہ انسانیت کے عظیم ترین ترکہ یعنی اپنی انفرادیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اس سے زیادہ سخت الزام کسی معاشری نظام کے خلاف کوئی دوسرا عائد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جماعت بہرحال افراد کا مجموعہ ہوتی ہے اور جو جماعتی نظام انفرادیت دبا ڈالے تو وہ اپنے مقصد کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

پھر اشتراکیت پسندوں کے پاس اس کا کوئی علاج بھی نہیں ہے کیونکہ نفع طلبی کی بے روک

ٹوک عملداری کے خلاف احتجاج کرنے میں تو وہ بلاشبہ حق بجانب تھے لیکن سرمایہ داری کے مرکزیت پسند طریقۂ پیداوار کو اپنی حالت پر برقرار رکھنے میں وہ ٹھیک نہیں تھے۔ کیونکہ سرمایہ داری کے مرکزیت پسند طریقہ پیداوار کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو اشیاء پیدا کی جانے والی ہیں اُن کے متعلق سوچنے اور منصوبہ بنانے کا کام مرکز کے چند با اقتدار آدمیوں کو سونپ دیا جائے اور باقی سب آدمی مشین کے بڑے پہیئے کے ایک حقیر جزو بنا دئے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام کرنے والے اشتراکیت کے نظام میں بھی اسی خرابی کا شکار ہو گئے جس کے وہ نظام سرمایہ داری میں شکار تھے یعنی یہ کہ اُن کا کام سوچ سمجھ کر کام کرنا نہ رہا، بلکہ غیر مشروط اطاعت اور فرماں برداری ہو گیا۔ مرکز پر جو لوگ ہیں اُن کے حکم کے مطابق ایک ہی قسم کی اشیاء کثیر پیمانے پر پیدا کی جانے لگیں اور اکثر ایسا ہونے لگا کہ ایک آدمی کا کام صرف یہ رہ گیا کہ جب ڈبے تیزی سے یکے بعد دیگرے اس کے سامنے سے گزریں تو وہ اُن پر لیبل لگاتا رہے اس کام کی یکسانیت روح کو مردہ کرنے والی ہے۔ اور جس مشین کو انسان نے بنایا تھا اُس نے آخر کار خود انسان کو ہی مشین بنا کر چھوڑا۔ کیونکہ اُس مشین کی طرح جسے وہ چلاتا ہے وہ بھی صرف ایک حرکت کرنا جانتا ہے۔ اور صرف اس وقت کام کرتا ہے جب مرکزی دفتر میں بٹن دبایا جاتا ہے۔ اُپج، جدت، اظہار نفس سب مفقود ہو گئے ہیں۔ اور اگر کہیں باقی ہیں تو وہ اس نظام میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ لیکن کیا اظہار نفس کی خواہش ایک انسان کا سب سے قوی محرک عمل نہیں ہے؟ ایک بچہ کو غور سے دیکھو وہ اُسی وقت سب سے زیادہ خوش نظر آتا ہے جب اُسے سب سے زیادہ موقع اظہار نفس کا ملا ہوا ہوتا ہے اور افسردہ ہو جاتا ہے جب اُس پر کسی طرح کی پابندی عائد کی جاتی ہے اور اگر اُسے روکا جائے تو بہت خفا ہوتا ہے۔ آپ اس کی ننھی ننھی اینٹوں سے اسے ایک خوبصورت سا منارہ بنا دیں۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوگا لیکن فوراً ہی اسے گرا دے گا تاکہ دوبارہ وہ خود بنائے۔ چاہے اس کا بنایا ہوا منارہ کتنا ہی کمزور ہو اور آسانی سے گر جائے لیکن وہ اپنے اس ذاتی کارنامے کو دیکھ کر خوشی کے مارے پھولا نہیں سمائے گا۔ یہی حال سیاسیات میں ہے۔ آخر لوگ حکومت

خود اختیاری کا کیوں مطالبہ کرتے ہیں بعض صورتوں میں ممکن ہے کہ بدیشی حکومت نہایت معقول ہو لیکن انسان محض معقولیت ہی کا تو متمنی نہیں ہوتا۔ دراصل وہ تو اظہار نفس کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا دعویٰ ہے کہ اچھی حکومت بھی حکومت خود اختیاری کی نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ چاہے مزدوروں اور کسانوں کی عام حالت سرمایہ داری کے مقابلے میں اشتراکیت کے ماتحت کہیں بہتر ہو کیونکہ سرمایہ داری کی طرح اشتراکیت میں پیداوار انفرادی مفاد کے لئے نہیں ہوتی لیکن جب تک اشتراکیت میں پیداوار کی مرکزیت موجود ہے اس وقت تک تنوع کی گنجائش نہیں ہو سکتی اور نہ عوام کو اظہار نفس کا موقع مل سکتا ہے۔

۳۔ ہندوستانی مشکلات کا حل
عدم مرکزیت اور سودیشی

اگر دنیا کا موجودہ اقتصادی نظام مسئلہ تعمیر قوم کا کوئی حل پیش نہیں کرتا جس کی آج ہمیں ضرورت ہے تو ہمیں کوئی ایسی معقول تدبیر تلاش کرنا ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنی قومی عمارت کی تعمیر کر سکیں۔ سرمایہ داری میں یہ شکل ہے کہ وہ ذاتی نفع حاصل کرنے کی پوری آزادی دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود غرضی۔ حرص۔ تشدد اور ناجائز فائدہ اٹھانے کے جذبات کو فروغ ہوتا ہے۔ اشتراکیت نے اس کے تدارک کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں وہ دوسری انتہا کو پہنچ گئی۔ یعنی اس نے ہر طرح کے ذاتی منافع کا انسداد کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انفرادی اظہار رائے کا باب قطعی مسدود ہو گیا۔

اس لئے ہمیں غور کرنا چاہئے کہ آخر ہماری نجات کس چیز میں ہے؟ ہم یہ نہیں طے کر سکتے کہ آیا ہمیں ذاتی نفع کا اصول ترک کر دینا چاہئے یا باقی رکھنا چاہئے۔ اس لئے ہم عجیب گو مگو میں ہے۔ لیکن جیسا کہ منطق جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ گو مگو کی یہ حالت محض خیالی ہوتی ہے اور ہمیشہ ایک درمیانی راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی ہماری نجات اسی درمیانی راستہ میں ہے اگر ہیگل، کا یہ قول صحیح ہے

کہ حق نہ تو دعوے میں ہوتا ہے نہ اس کی تردید میں بلکہ ان دونوں کی امتزاجی ترکیب میں ہوتا ہے جس میں دونوں کے صحیح اجزا شامل ہوتے ہیں تو پھر ہم بھی اپنی مشکل کا حل معلوم کر سکتے ہیں خوش قسمتی سے ارادی طور پر یا غیر ارادی طور پر ہمارے آبا و اجداد بھی اسی پر عمل کرتے آئے ہیں اور یہی ہماری مشکلات کا حل ہے کہ نہ تو انفرادی نفع کا اصول اپنی جگہ پر غلط ہے اور نہ اجتماعی قبضہ و اختیار میں کوئی بُرائی ہے۔ البتہ اگر انفرادی نفع کا اصول اپنے حدود سے تجاوز کر جائے اور اس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے لگے تو وہ بُرا ہے اسی طرح اگر اجتماعی قبضہ و اختیار کا اصول اپنے حدود سے گذر جائے اور افراد کی آزادی عمل سلب کرے تو وہ بھی بُرا ہے ایسی حالت میں ہمیں کوئی ایسی تدبیر نکالنی چاہیئے جس میں انفرادی نفع اور اجتماعی قبضہ و اختیار دونوں کی گنجائش ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ صورت صرف اس طرح ممکن ہو سکتی ہے کہ پیداوار کی مرکزیت کو ختم کر دیا جائے اور سودیشی کے اصول کو رواج دیا جائے۔ عدم مرکزیت کا منشا یہ ہے کہ مرکز سے یہ ہدایت نہ دیجائے کہ کس قسم کی اشیا پیدا کی جائیں اور کس طرح بلکہ پیدا کرنے والے کے ذوق اور استعداد پر اس معاملے کو چھوڑ دیا جائے۔ صرف اسی صورت میں عوام کو ذاتی اظہار رائے اور ذاتی عروج کا موقع مل سکتا ہے۔ اس کے خلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہر شخص کو اپنا من مانا کرنے کی اجازت دیدی جائے تو اس کا نتیجہ وہی سرمایہ داری ہوگی، کیونکہ ایک شخص کو اپنی حرص کی وجہ سے پیداوار پر قابض ہونے کا موقع ملے گا، یہ صحیح ہے لیکن بہر حال اس کا انسداد کرنا ہوگا اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ بڑی مشینوں سے کام نہ لیا جائے اور زیادہ مقدار میں پیداوار نہ ہو۔ یعنی صرف وہی مشینیں استعمال کیجائیں جن میں صرف ایک شخص کام کر سکے مثلاً سینے کی مشین۔

علاوہ ازیں ہمیں عوام میں سودیشی کی تبلیغ کرنا ہوگی تاکہ وہ اپنے قریب ترین لوگوں کی بنائی ہوئی چیزیں دور والوں کی تیار کردہ چیزوں کے مقابلے میں استعمال کرنا اپنا فرض سمجھیں۔ بالفاظ دیگر ہمیں ہر گاؤں کو کافی بالذات بنانے کے قدیم نظریئے کو از سر نو جاری کرنا ہوگا۔ تاکہ

لوگوں کی خاص خاص ضرورتیں خود ان کے گاؤں میں پوری ہوسکیں اور بڑی حد تک باہر کے محتاج نہ رہیں۔ اگر ہر گاؤں اس طرح باہر سے مستغنی ہوجائے اور اپنی خاص خاص ضروریات خود پوری کرنے لگے تو ہر کاریگر صرف اُتنی مقدار میں چیزیں تیار کرے گا جتنی اس کے گاؤں کو ضرورت ہو۔ یعنی پیداوار گاؤں کی مانگ کے مطابق محدود ہوجائے گی۔ اور جب یہ صورت ہوگی تو نہ زائد از ضرورت پیداوار کا سوال پیدا ہوگا۔ اور نہ نئے نئے بازار تلاش کرنے کی مشکل درپیش آئے گی۔ پھر کوئی تمام پیداوار پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش نہ کرے گا کیونکہ جب سودیشی کے استعمال کی وجہ سے ہر گاؤں کو اپنے گاؤں کے باہر کی چیزوں کی ضرورت نہ رہیگی تو وہ اسے سعی لاحاصل سمجھے گا۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سودیشی کا صحیح مفہوم واضح کردیا جائے اور تمام امکانی غلط فہمیاں رفع کردی جائیں کیونکہ سودیشی اور تنگ خیال جماعت بندی میں واقعی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ تنگ نظر جماعت بندی میں تو ایک شخص اپنی ہی جماعت۔ فرقہ۔ یا طبقہ کی چیزیں استعمال کرنے کی قسم کھاتا ہے اور دوسرے کی اس کے یہاں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اسے کسی اصول سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر اس پر عمل کیا جائے تو قومی اور بین الاقوامی اتحاد کے لئے منافی ثابت ہوتا ہے۔ فی زمانہ ریڈیو۔ ہوائی جہاز اور تار برقی وغیرہ نے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کردیا ہے۔ گویا فاصلے کے لحاظ سے دنیا سمٹ گئی ہے۔ ایسی حالت میں یہ انتہائی حماقت ہوگی کہ دنیا کو چھوٹے چھوٹے محدود حلقوں میں تقسیم کردیا جائے جہاں ایک حلقہ کا دوسرے سے کوئی تعلق ہی باقی نہ رہے۔ حامیان سودیشی کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے۔ ان کا منشا تو محض یہ ہے کہ "خیرات پہلے گھر ہی سے شروع ہونا چاہئے"۔ ہم پر سب سے پہلے ہمارے قریب ترین پڑوسی کا حق ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ حلقہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تمام بنی نوع انسان کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک خاندان کو لیجئے ہر شخص اپنے اہل و عیال اور اپنے افراد خاندان سے زیادہ متعلق اور منسلک ہوتا ہے اس لئے

دوسروں کے مقابلے میں اس کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کے خورونوش کا انتظام کرے اور انھیں ننگا بھوکا نہ رہنے دے اپنے خاندان کے فرائض سے عہدہ برا ہونے میں گویا وہ سماج اور تمام بنی نوع انسان کے فرائض سے سبکدوش ہوتا ہے۔ یہ تمام دائرے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں بلکہ ان سب کا مرکز ایک ہی ہے یعنی ایک کے اندر ایک واقع ہیں۔ چھوٹے اور بڑے دائرے میں کوئی مخالفت یا تضاد نہیں ہے اس لئے اگر ہم چھوٹے دائرے کی خدمت کریں تو گویا وہ بڑے دائرے کی بھی خدمت ہوگی۔ لہذا سودیشی کا یہ مفہوم ہوا کہ قریب ترین لوگوں کا پہلے حق ادا کیا جائے کیونکہ دوسروں کے مقابلے میں ان کا ہم پر زیادہ حق ہے۔ لیکن اس کا یہ منشار نہیں ہے کہ ہم ایک خاص طبقہ تک اپنے آپ کو محدود کرلیں اور باہر کے افراد کے حقوق بالکل نظرانداز کردیں۔ اس سلسلے میں یہ کہاوت کہ "خیرات گھر سے شروع ہونا چاہئے" بالکل صادق آتی ہے۔ کیونکہ اس میں خیرات کے گھر سے شروع ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ نہیں کہا ہے کہ خیرات گھر ہی میں ختم بھی ہوجانا چاہئے۔ اسی طرح سودیشی تحریک کا بھی یہی منشار ہے کہ پہلے ہر شخص اپنے گاؤں کے حقوق سے عہدہ برا ہو پھر رفتہ رفتہ اپنے دائرۂ عمل کو تمام نوع انسانی تک پھیلادے۔ یہ مسئلہ اتنا اہم ہے اور اس میں اتنی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے کہ سودیشی تحریک کے بانی کے الفاظ بجنسہ نقل کردینا زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں کہ "سودیشی ہی ایک ایسا اصول ہے جو انسانیت اور محبت کے عین مطابق ہے۔ اگر میں اپنے خاندان ہی کا پوری طرح حق ادا نہیں کرسکتا تو سارے ہندوستان کی خدمت کا خیال عبث ہے۔ اس لئے یہ مناسب ہے کہ میں اپنی تمام سرگرمیوں کو اپنے خاندان کے لئے وقف کردوں اور یہ یقین رکھوں کہ اس طرح ساری قوم بلکہ ساری دنیا کی خدمت کررہا ہوں۔ اسی کا نام محبت ہے اور یہی انسانیت ہے۔

ہر فعل کی نوعیت نیت پر منحصر ہوتی ہے۔ مثلاً اگر میں دوسروں کی تکلیف کا لحاظ کئے بغیر اپنے خاندان کی غلط خدمت انجام دوں جیسے فرض کیجئے کہ میں کوئی ایسی ملازمت یا کاروبار کرلوں جس میں دوسروں سے زبردستی روپیہ حاصل کیا جائے تو میں اپنے خاندان کو مالا مال

کر دوں گا اور اُس کی تمام ناجائز ضروریات بھی پوری کر دوں گا لیکن حقیقت میں نہ تو یہ خاندان کی صحیح خدمت ہوئی اور نہ ملک و قوم کی۔ بخلاف اس کے اگر میں یہ کہوں کہ خدا نے مجھے ہاتھ پیر اس لئے دئے ہیں کہ میں صرف اپنی اور اپنے متعلقین کی پرورش کروں تو گویا میں اپنی زندگی کو سادہ اور آسان تر بناتا ہوں۔ اس طرح مجھ سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور صرف اپنے قریب ترین لوگوں کی خدمت انجام دوں گا۔ تصور کیجئے کہ اگر ہر شخص یہی طرزِ عمل اختیار کرلے تو ملک کی حالت کتنی بہتر اور قابلِ رشک ہو جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ سب کے سب بہ یک وقت اس پر عمل نہیں کر سکتے لیکن جو کریں گے وہ بہر حال منزلِ مقصود کو قریب تر کرنے میں ممد ثابت ہوں گے اگر میں تمام دوسرے ممالک کو نظر انداز کرکے صرف ہندوستان کی خدمت کرنا چاہوں تو میرے اس طرز عمل سے کسی ملک کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ میری خدمت مقابلے کی نوعیت کی نہ ہوگی" اپنی چیز کو اس طرح استعمال کرو کہ اُس سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے" یہ نہ صرف ایک اعلیٰ قانونی نظریہ ہے بلکہ ایک زرین اصول ہے۔ اہنسا اور محبت پر عمل کرنے کا ایک معقول ذریعہ ہے۔ ہم اس عقیدے کے علمبردار ہیں اس لئے ہمیں اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا چاہئے کہ وہ وطن پرستی جس کی بنیاد محبت پر قائم ہو حیات بخش ہوتی ہے لیکن جس کی بنیاد نفرت پر ہو وہ روح کو فنا کر دیتی ہے"[1]

گویا سودیشی کی تحریک اپنے مفہوم میں پوری وسعت رکھتی ہے۔ جب ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ساری دنیا ایک "کُل" ہے اور اس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے بہت زیادہ منسلک ہیں تو سودیشی کا مفہوم یہ ہوا کہ ایک محدود حلقے کی خدمت ساری دنیا کی خدمت کے مترادف ہے بشرطیکہ اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ دوسروں کو بھی اسی طرح اپنے محدود حلقے کی خدمت کا حق حاصل ہے۔

اسی اصول کے مطابق پھر یہ سوال ہی پیدا نہ ہوگا کہ چند بہتر اور زیادہ اہل پیدا کرنیوالے دوسروں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے یا انھیں اپنا غلام بنائے رکھیں گے کیونکہ جیسا کہ ہم

---

(۱) خیالات مہاتما گاندھی از سی۔ ایف۔ انڈریوز ص ۱۲۶ - ۱۲۷

پہلے بھی عرض کر چکے ہیں اس حالت میں پیداوار تو صرف مقامی ضروریات تک محدود ہوگی۔ اور موجودہ سرمایہ داری کی سی حرص اور خود غرضی کا کوئی موقع ہی نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں مانگ کے مطابق پیداوار مساوی طور پر تقسیم ہوگی۔ جب پیداوار مساوی ہوگی تو منافع بھی مساوی ہوگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دولت صرف چند افراد کے پاس جمع نہ ہو سکے گی۔ آمدنی کی افراط اور تفریط جاتی رہے گی، جس کی وجہ سے افلاس اور فاقہ کشی کی مصیبت دور ہو جائے گی اور سب کو کافی خوراک ملنے لگے گی۔

البتہ ایک گاؤں دوسرے گاؤں سے مختلف چیزوں کا تبادلہ کیا کرے گا کیونکہ ہر گاؤں دنیا کی ساری چیزیں نہیں تیار کر سکتا۔ اور اگر اس کی کوشش بھی کرے تو ناممکن ہوگا کیونکہ ہر جگہ کے مقامی حالات اور خام پیداوار مختلف ہوتی ہے۔ لیکن یہ تجارت یک طرفہ نہ ہوگی بلکہ باہمی ہوگی تاکہ کوئی گاؤں پیداوار کا ایسا مرکز نہ بن جائے جس سے دوسرے گاؤں کو نقصان پہنچے۔ اور ان کا روزگار جاتا رہے۔ یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ چیز کیسے حاصل ہوگی۔ اس کا جواب صاف ہے۔ اگر سودیشی کی اہمیت عوام کے ذہن نشین کر دی جائے اور رائے عامہ کو اس کے لئے تیار کر لیا جائے تو یہ مسئلہ بہت آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ لوگ خود بخود قریب کی تیار شدہ چیزوں کو دور کی آئی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں ترجیح دیں گے۔ لیکن اس دوران میں دیہاتی پنچایتوں کو از روئے قانون یا بذریعہ محصول اس کا انتظام کرنا ہوگا کہ باہر کی چیزیں بلا ضرورت نہ آنے پائیں۔ اس سے نہ صرف گاؤں کا اقتصادی توازن قائم رہے گا بلکہ لامحدود ذاتی منافع حاصل کرنے کی کوششوں کا بھی قلع قمع ہو جائے گا۔ پیداوار کی عدم مرکزیت کی بدولت جب ہر گاؤں اپنی ضروریات کے لائق خود پیدا کرے گا تو بازاروں کے لئے مقابلہ مفقود ہو جائے گا اور جب بازاروں کا مقابلہ نہ ہوگا تو جنگ یا اجتماعی تشدد کی بھی ضرورت نہ پڑے گی۔ اس طرح ملک میں خصوصاً اور ساری دنیا میں عموماً امن و خوش حالی کا دور دورہ ہوگا۔ علاوہ ازیں چونکہ عدم مرکزیت کے مطابق ہر مزدور کو یہ آزادی حاصل ہوگی کہ وہ جو چاہے اور جس طرح چاہے تیار کرے۔ اس لئے اختراعی کوشش

اور انفرادی ترقی کے لئے بھی کافی میدان ملے گا۔ فرمائیے کسی سماجی نظام سے اس سے زیادہ اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔

لہذا انہی اصولوں پر ہمیں اپنی قومی زندگی کی داغ بیل ڈالنا چاہئے کیونکہ یہ نہ صرف سرمایہ داری اور اشتراکیت کے معائب کا انسداد کرتے ہیں بلکہ ہمارے آبا واجداد کی یادگار بھی ہیں۔ ہم پہلے بھی اس جانب اشارہ کر چکے ہیں کہ ہمارا قدیم دیہی نظام لامحدود ذاتی منافع کا سخت مخالف تھا۔ اور اس کا حامی تھا کہ آمدنی میں افراط و تفریط نہ ہو تاکہ سب کو کھانے پینے کے لئے کافی ملجائے اور ہر گاؤں اپنے طور پر مستغنی بالذات ہو جائے۔ ہمارے نزدیک یہ تمام باتیں پیداوار کی مرکزیت کو مٹانے سے اور مذکورۂ بالا طریقہ پر سودیشی پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہیں (باقی)

تنقید و تبصرہ

البذور البازغہ ۔ مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ۔ حجم ۱۴ جزو تقطیع ۲۰×۳۰ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ ۔ قیمت فی نسخہ ۱۲؍ ۔ ملنے کا پتہ: ناظم صاحب مجلس علمی ڈابھیل ملک (سورت)

البذور البازغہ جو تدبیر نفس اور تدبیر منزل سے لے کر تدبیر مدن اور مباحث الٰہیہ تک حاوی ہے ۔شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی وہ نادر تصنیف ہے جو اب تک شائع نہیں ہوئی تھی ۔ ڈابھیل کی مجلس علمی جملہ علم دوست حضرات کے شکریہ کی مستحق ہے جس نے شاہ صاحب موصوف کی "خیر کثیر" کو شائع کرنے کے بعد اب یہ ان کی دوسری کثیر المنافع کتاب شائع کی ۔ اس میں حضرت شاہ صاحب نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی اور جسمانی اور روحانی زندگی کے جملہ اسباب و وسائل اور حالات و کیفیات و مراتب و فضائل وغیرہ کو نہایت صاف اور واضح طور پر بیان کیا ہے اور حقائق شرعیہ اور وسائل الٰہیہ کو اس تدریس اور سہل عبارت میں لکھا ہے کہ ہر استعداد کا شخص بہرہ اندوز ہو سکتا ہے بشرطیکہ عربی جانتا ہو ۔ کیونکہ یہ کتاب عربی میں لکھی گئی ہے ۔

ہم کو یہ سن کر اور بھی خوشی ہوئی ہے کہ اس کتاب کے بعد "مجلس علمی" شاہ صاحب کی مشہور تصنیف "تفہیمات الٰہیہ" کے چھاپنے کا قصد رکھتی ہے تفہیمات کی اشاعت میں دو امور کی طرف ہم مجلس علمی کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں ۔ ایک یہ کہ عربی اور فارسی تفہیمات کے حصے الگ الگ کر لئے جائیں اور دونوں کی اشاعت بھی الگ ہو ۔ مخلوط زبانوں میں کسی کتاب کا شائع کرنا پسندیدہ نہیں ۔ دوسرے یہ کہ ہر حصہ کی فہرست بنا کر کتاب کے شروع میں ضرور لگا دی جائے ۔ کیونکہ ہر ایک تفہیم ایک مستقل اور جداگانہ نکتہ ہے ۔ ایک دوسرے سے کمتر تعلق ہے ۔ اگر فہرست نہ ہوگی تو کتاب زیادہ نفع رساں نہ ہو سکے گی ۔

ا ، ج

تفسیر سورۃ الفیل - مصنفہ مولانا عبدالحمید بی اے فراہی بزبان عربی۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۴۲ صفحات قیمت فی نسخہ ۸ر ملنے کا پتہ۔ ناظم صاحب مدرسۃ الاصلاح - سرائے میر۔ ضلع اعظم گڈھ۔

مولانا عبدالحمید مرحوم اس آخری دور میں نہ صرف قرآن کے ایک اچھے مفسر تھے بلکہ قرآن فہمی کی امامت ان پر منتہی تھی۔ انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اسی کتاب کریم کی خدمت میں صرف کیا۔ وہ ربط آیات کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھتے ہیں اور قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کرتے ہیں۔ مگر جو کچھ انھوں نے لکھا وہ زیادہ تر عربی میں لکھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے انھوں نے قران کے ایک معتد بہ حصہ کی تفسیر چھوڑی ہے۔ بعض بعض اجزا ان کی تفسیر کے ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئے تھے جو ہندوستان سے مصر اور عرب تک پہنچے۔ مگر ان کے انتقال کے بعد سے پھر کوئی جزو شائع نہیں ہوا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ان کے بھائی حاجی رشید الدین صاحب نے تفسیر سورۃ الفیل شائع کی۔ انھوں نے یہ بھی امید دلائی ہے کہ آئندہ وہ دوسرے اجزا بھی شائع کریں گے۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ ہمارے دوست ڈاکٹر حافظ حفیظ اللہ صاحب سول سرجن بارہ بنکی۔ نیز جناب حفیظ احمد صاحب منصف لنگسگور ضلع رائچور (دکن) کے عطایا سے یہ حصہ چھپا ہے۔ اس لئے اس تفسیر کی اشاعت پر رشید الدین صاحب کے ساتھ ان حضرات کے بھی ممنون ہیں۔ (ا - ج)

کلام ٹیگور حصہ اول - مترجمہ از پروفسر ایم ضیاء الدین صاحب شانتی نکیتن۔ تقطیع متوسط الہ آبادی ٹائپ، طباعت روشن کاغذ نہایت نفیس۔ قیمت ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ وشوا بھارتی بک شاپ ۲۱۰ کارنواس اسٹریٹ کلکتہ۔

پروفسر ضیاء الدین صاحب نے ٹیگور کی بہت سی اچھی اچھی نظموں اور گیتوں کا ترجمہ کرکے انھیں کتابی صورت میں مرتب کر دیا ہے ان میں سے بہت سے گیت ایسے ہیں جو شانتی نکیتن میں عام طور پر گائے جاتے ہیں نظمیں مختلف بنگالی تصانیف میں سے لی گئی ہیں شروع میں ایک دیباچہ

ہے جو پروفسر صاحب نے بہت غور اور توجہ سے لکھا ہے۔

اب سے کچھ ہی دنوں پہلے ٹیگور کی شاعری کا ہمارے نوجوان ادیبوں پر بہت اثر تھا اور اور اکثر ادبی رسائل میں ادب لطیف، ادب جمیل کے عنوان سے نظم نما نثریں شائع ہوتی رہیں لیکن بجز چند افسانوں اور گیتان جلی باغبان اور چترا کے ترجموں اب تک کوئی سنجیدہ کوشش ٹیگور کے کلام کو اُردو میں منتقل کرنے کی نہیں کی گئی۔ پروفسر صاحب کا یہ کام اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ انھوں نے ٹیگور کو اور اُن کی شاعری کو بہت قریب سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

اپنے فاضلانہ مقدمے میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ ٹیگور نے کس ماحول میں نشو و نما پائی کس طرح انھوں نے اپنی شاعری کو سنسکرتی عروض کی زنگ خوردہ زنجیروں سے علحدہ اور بنگالی ادب کو آزاد کیا اس بغاوت پر قدیم ڈگر پر چلنے والے شاعروں نے کیا کیا طوفان نہ اٹھائے لیکن شاعر نے اس کی ذرا پروا نہ کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج بنگالی شاعر اور ادیب اُسی کے راستے پر گامزن ہیں ٹیگور کی شاعری کی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "ٹیگور کی شاعری کی ما بہ الامتیاز خصوصیت اس کا بے ساختہ پن ہے۔ کسی مسئلہ کو سمجھانے کے لئے یا کسی حکیمانہ معنی کو سلجھانے کے لئے وہ شعر نہیں کہتے دل میں جو کچھ گذرتا ہے وہ شعر ہو کر ادا ہو جاتا ہے۔ یہ شعر کسی بنیادی حقیقت اور کائنات کے سربستہ راز کو فاش کر دینے کی غرض سے زبان پر نہیں آتا۔ نہ اس کا مطلب کوئی علمی حقیقت یا مفید مطلب اخلاقی نصیحت بیان کرنا ہوتا ہے۔ ایک بیتاب آنسو یا بے اختیار مسکراہٹ کی طرح شعر دل کی کیفیت کی تصویر ہوتا ہے۔ اگر فلسفہ یا مذہب ان اشعار میں اپنے مفید مقصد کسی حکمت یا معرفت کو موجود پائے تو تعجب کی بات نہیں۔ مگر شعر کی اپنی زندگی کا مقصد الگ ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"ٹیگور کی وہ خصوصیت جو مجموعی طور پر ہم ان کے کلام میں موجود پاتے ہیں ان کی تمثیل

شخصیت ہے شاعر کے مذہبی مقالات میں وسیاسی اور معاشرتی تحریروں میں، ادبی مضامین میں، ڈراموں اور ناولوں میں۔ ان کے اشعار میں ہم ان ہی کی بے نظیر شخصیت کو نغمہ سرا پاتے ہیں یہ شخصیت حیرت انگیز طور پر شاعرانہ حکیمانہ اور روشن واقع ہوئی ہے۔"

سلسلۂ کلام میں انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ:

"ٹیگور کی عظمت کا سنگِ بنیاد، ان کی لاثانی شخصیت کا مدار وہ نغمہ ہے جو انھوں نے اس حسین دنیا کے تن بدن میں حسن وسرور کی روح پھونکنے والے۔ شاعر کائنات محض حسن محض سرور کی مدح وثنا میں گایا ہے۔ اور ٹیگور نے وہ گیت سنے ہیں جو مغنی فطرت اپنے قدرتی مظاہر میں ہمیشہ سے گائے جا رہا ہے۔ ٹیگور کا دل ودماغ ان ہی قدرتی گیتوں کے لاجواب سُروں سے گونج رہا ہے اور وہ خود مجسم سرور اور نغمہ ہو کر گاتا ہے۔ ٹیگور کا معبود اور معشوق وہ شاعر اور مصور ہے جو اس کی زندگی میں لطف وسرور اور غم واندوہ کی سریں پھونک رہا ہے اس کی زندگی میں عجیب وغریب کے رنگ بھر رہا ہے۔ شاعر اس کے عشق میں اور اسی کے حسن کو قدرت میں دیکھ کر اس کی تعریف میں نغمہ سرا ہے اور اس کے گیتوں کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہ صرف اس زمانے میں بے مثل ہیں بلکہ ہر زمانے میں اپنے حسن کے لحاظ سے کم یاب رہیں گے۔"

"ایشیا کا مخصوص عرفان۔ اپنشدوں کا گیان، جو رشیوں کی خصوصیت تھا وہ عصر حاضر کی آزادی اور جدید علمی تحقیقات اور فلسفیانہ حقائق کی روشنی سے مل کر ایک حیرت انگیز عرفانی موزونیت کی صورت میں ہم ٹیگور میں موجود پاتے ہیں جبکہ ٹیگور موجودہ زمانے کے مہذب ترین اور روشن ترین دل ودماغ کا مالک ہے وہ اس دولت کا بھی پورا پورا وارث ہے جو قدیم زمانوں سے ہر مذہب وملت کا سرمایۂ عرفان رہی ہے۔"

انھوں نے شاعری کی اصلاح کے سلسلے میں خود ٹیگور کے خیالات بھی نقل کئے ہیں طوالت کا خوف مانع ہے ورنہ وہ بھی اس قابل تھے کہ یہاں نقل کئے جاتے۔ اپنے مقدمے کے آخر میں انھوں نے ایک بہت معقول بات کہی ہے جو ٹیگور کے طرز کے مقلدین کے لئے لائق توجہ ہے۔

"اُردو ادیوں پر جس چیز کا سب سے زیادہ اثر ہوا ہے وہ ٹیگور کی انگریزی کتاب گیتانجلی ہے۔ اس اثر کے نتائج زیادہ تر وہ نثری نظمیں ہیں جو رسائل اور اخبارات میں ادب لطیف اور ادب جمیل کے عنوانوں کے ماتحت شائع ہوتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ٹیگور کے رنگ میں شعر کہنے کے لئے جس زبان اور جس عروض کی ضرورت ہے وہ ہمارے یہاں ابھی تک تیار نہیں ہوئی یہی وجہ ہے کہ ہر کوشش ناکام ثابت ہوتی ہے۔ علاوہ ان مشکلات کے ٹیگور کا رنگ ذاتی ہے۔ بے حد شخصی۔ ان کے طرز کی تقلید کسی سے بن نہ آئے گی جس چیز کی تقلید ہمارے ادب کے لئے واقعی مفید ہو سکتی ہے وہ ٹیگور کی اس روش اور اس سلوک کی تقلید ہے جو انھوں نے بنگالی ادب کے ساتھ کیا ہے۔ ہمیں ٹیگور کے انقلابی پہلو کی تقلید کرنا چاہئے ۔ ۔ ۔ ۔ طرز میں تقلید ادیب کی خودکشی کے مرادف ہے۔ ٹیگور کا رنگ اُس کے ذاتی عرفان کا عکس ہو۔ ہر ادیب کی روش اس کی شخصیت کی آئینہ دار ہونی چاہئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پروفسر صاحب نے اپنے ترجمہ کے متعلق بہت انکسار سے کام لیا ہے افسوس ہے کہ ہم اصل بنگالی زبان سے نابلد ہیں اس لئے ترجمے کے بارے میں ہم کوئی صحیح رائے ظاہر کرنے سے معذور رہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عبارت نہایت صاف سلیس اور رواں ہے اور ترجمہ نہایت محنت و کاوش سے کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ٹیگور کا کلام جب دوسرے قالب میں آ کر اتنا حسین ہے تو اپنے اصلی خدوخال میں کیسا حسین و جمیل ہوگا۔ طوالت کا خوف ہے ورنہ ہم یہاں دو ایک اقتباسات اس کے ضرور دیتے۔ شروع میں ٹیگور کی ایک بہترین تصویر بھی ہے۔

م، ح، ح

فلسفۂ جمال۔ از جناب یاض الحسن صاحب ایم اے۔ تقطیع جامعہ کی حجم چھیاسی ۸۶ صفحات۔ ٹائپ خوشنما۔ طباعت اچھی۔ کاغذ نفیس۔ قیمت عمر ملنے کا پتہ کتابستان اے سٹی روڈ الہ آباد۔

یہ مقالہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی جانب سے شائع ہوا ہے اور اس میں مختلف عنوانات فلسفۂ جمال حسن اور آرٹ۔ ہم آہنگی و وحدت حسین اور بدصورت کا تعلق فن کی بزرگی و عظمت، آرٹ اور اخلاق کے ماتحت فلسفۂ جمال کی تشریح و توضیح کی گئی ہے حسن و جمال کا فلسفیانہ تجزیہ بجائے خود نہایت دلچسپ ہے اور جناب مصنف نے یہ کام بڑی کامیابی سے انجام دیا ہے۔ طرز بیان خوشگوار دلنشین اور شگفتہ ہے۔ شروع سے آخر تک تحریر میں کہیں بھی یبوست اور خشکی نہیں آنے پائی ہے جہاں کہیں سمجھانے کے لئے مثالوں کی ضرورت پیش آئی ہے تو اردو اور فارسی کے اشعار سے کام لیا گیا ہے جس سے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی اس قسم کے مختصر مقالے شائع کر کے اردو زبان کی مفید خدمت انجام دے رہی ہے اس قسم کی کوششوں سے نہ صرف یہ کہ زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے بلکہ لوگوں کے ذہنی و دماغی اور علمی معیار میں بھی آہستہ آہستہ رفعت اور بلندی پیدا ہوتی ہے۔ م، ح، ح

تذکرۂ محسن - از جناب مولوی محمد امین صاحب زبیری سابق مہتمم تاریخ بھوپال۔ تقطیع متوسط حجم ۲۲۴ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ کاغذ متوسط۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یا انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

یہ محسن الملک مرحوم کے سوانح حیات ہیں جنھیں محمد امین زبیری صاحب نے بڑی کاوش و تحقیق سے مرتب کیا ہے۔ شروع میں دیباچہ و انتساب کے بعد محسن الملک کے ابتدائی حالات ہیں جو صرف دو صفحوں میں ختم ہو گئے ہیں پھر اُن کی خدمات حیدرآباد کا ذکر ہے۔ حیدرآباد کے دور آخر کے عنوان سے وہاں کی سازشوں اور امراء ریاست کی معاصرانہ رقابتوں کی تفصیل ہے اور بتایا ہے کہ اس پیچیدہ اور نازک زمانے میں محسن الملک نے کس قدر دیانت۔ خوش اسلوبی اور تدبر سے کام کیا۔ تاآنکہ ان کو اپنے منصب سے الگ ہونا پڑا۔ اس کے بعد نواب صاحب کی تعلیمی، سیاسی، اور مذہبی خدمات کا تذکرہ ہے۔ پھر اُن مشکلات کی تفصیل ہے جو علی گڑھ کی

سیاسیات کے سلسلے میں نواب صاحب کو پیش آئیں پھر اُن کی زندگی کے آخری زمانے کے حالات ہیں اُن کے علالت اور انتقال تعزیت کے جلسوں اور پیغامات درج کئے گئے ہیں، اُن کے اخلاق وعادات بیان کئے گئے ہیں اور اُن کے فضائل و خصوصیات پر اُن کے معاصرین کا تبصرہ ہے پھر محسن الملک کے عنوان سے جناب مولانا عبدالحق صاحب کا ایک بہت اچھا مضمون ہے۔ آخر میں انگریزی میں چند انگریز افسروں کے خطوط اُن کی آرا کے اقتباسات اور فارسی میں امیر حبیب اللہ خاں کی وہ رائے درج ہے جو انھوں نے علی گڑھ کالج کے بارے میں اپنی تشریف آوری کے موقع پر ظاہر کی تھی۔

نواب محسن الملک مرحوم کا شمار اُن چند مخلص افراد میں ہے جو اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے جیتے ہیں اُن کی زندگی کا بہترین حصہ قوم و ملک خصوصاً مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی کوششوں میں گذرا ہے۔ اُن کی موت بھی ایسے وقت میں ہوئی جبکہ وہ قومی کاموں کے سلسلے میں شملے تشریف لے گئے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ملک کے محسن تھے۔ ان کے طریقۂ کار اور مصلحت اندیشیوں سے لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے خلوص میں شبہ کی مطلق گنجائش نہیں۔ بلاشائبہ ریب قوم کی خدمت گزاری میں سرسید کے بعد اُن ہی کا مرتبہ ہے اور یہ مسلمانوں کی احسان ناشناسی ہے کہ ایسے بزرگ قوم کی اب تک کوئی سوانح عمری نہیں لکھی گئی تھی زیر نظر کتاب نے اس الزام کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے۔ زبیری صاحب نے یہ کتاب بڑے سلیقے سے مرتب کی ہے۔ انھوں نے اس سے پیشتر بھی کئی کتابیں اسی موضوع پر لکھی ہیں اور یہ غالباً اُن کی تیسری کامیاب کوشش ہے البتہ ہمیں اُن سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے اس زمانے کی ترقی پذیر جماعت کے اختلاف کا تو کہیں کہیں دبی زبان اور کچھ مخالفانہ انداز میں ذکر کر دیا ہے لیکن اس جماعت کے نقطۂ نظر اور وجوہ اختلاف کی تفصیل نہیں لکھی جس سے کتاب یک رُخی ہو گئی ہے۔ کتاب میں نواب صاحب نواب وقار الملک سر راس مسعود اور خود جناب مؤلف کی عکسی تصویریں بھی ہیں نواب صاحب کا عکس تحریر بھی ہے۔ (م۔ح۔ح)

غالب شکن ۔ نوشتہ مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی سب رجسٹرار حیدرآباد دکن تقطیع خرد ضخامت دو جزو۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت درج نہیں۔ مصنف سے مل سکتی ہے۔

یہ ایک خط ہے جو مرزا یگانہ صاحب آیات وجدانی نے سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی کو لکھا۔ اس میں انھوں نے مرزا غالب کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں جو اس افراط کا ردعمل ہیں جو غالب مرحوم کے متعلق جدید تعلیم یافتہ جماعت نے کیا ہے۔ مرزا یگانہ نے نہ صرف غالب کے کلام ہی کی تنقیص کی ہے بلکہ اُن کے کمال کے ساتھ اُن کے خلوص اور اخلاق پر بھی حملے کئے ہیں چونکہ وہ ایک نکتہ سنج اور شگفتہ نگار صاحب قلم ہیں اس وجہ سے جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ دلچسپ ہے اگرچہ حقیقت سے وہ بھی اسی قدر بعید ہے جس قدر جدید تعلیم یافتہ جماعت کا خیال۔ ایک طرف اگر افراط ہے تو دوسری طرف تفریط ہے۔ اور صحیح راستہ کچھ بین بین ہی ہے آخر میں انھوں نے مرزا غالب کے متعلق کچھ رباعیاں لکھی ہیں جن میں سے چند اس لئے درج کرتا ہوں کہ ان کے خیالات کی نوعیت سے ناظرین آشنا ہوجائیں۔

غالب کے سوا کوئی بشر ہے کہ نہیں　　اوروں کے بھی حصے میں ہنر ہے کہ نہیں
مردہ بھیڑوں کو پوجتا ہے ناداں　　زندہ شیروں کی بھی کچھ خبر ہے کہ نہیں

اک شاعر کہنہ سال کہہ سکتے ہو　　پینے کا شریک حال کہہ سکتے ہو
جو چاہو کہو یار۔ مگر یہ تو کہو　　غالب کو نمک حلال کہہ سکتے ہو

کیا جانیں ادھورا ہے کہ پورا شاعر　　جب منہ میں زباں نہیں تو کیسا شاعر
سچ کہتے ہیں مرزا یگانہ صاحب　　غالب نہ ہوگا کوئی گونگا شاعر

وہ جاتے ہیں مرزا یگانہ۔ وہ دیکھ　　میدان سخن کے مرد یکتا۔ وہ دیکھ

غالب کے پٹیت ۔ دشمنِ جانِ ادب　　　　وہ کان لئے جاتا ہے کوّا ۔ وہ دیکھ

شہرتِ کاذبہ ۔ المعروف بہ خرافات عزیز ۔ یہ رسالہ بھی جو چھوٹی تقطیع پر ۶ جزو کا ہے مرزا یگانہ کی تصنیف ہے ۔ جس میں شروع میں مولوی غازی الدین بلخی بی اے کے قلم سے وہ معرکے جو لکھنؤ میں وہاں کے شعرا کے ساتھ مرزا صاحب کو پیش آئے لکھے گئے ہیں ۔ پھر مرزا صاحب کے قلم سے عزیز کی شاعری پر جو گذشتہ ماہ میں انتقال کر گئے شاعرانہ تنقید ہے ۔ یہ تنقید ادبی نقطۂ نظر سے لطف سے خالی نہیں ۔ کہیں کہیں اس کی محققانہ روش مفید بھی ہے ۔ میرے خیال میں اہل ادب کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے ۔ معلوم نہیں کہ عزیز مرحوم کی طرف سے اس کا جواب بھی لکھا گیا یا نہیں ۔ اس کی قیمت ۸ ر ہے اور یہ بھی مصنف سے مذکورہ بالا پتہ سے مل سکتی ہے ۔　　　　ا ، ج

آہنگِ رزم ۔ از جناب وقار انبالوی ۔ تقطیع جیبی ۔ ضخامت ۹۲ صفحات ، کتابت و طباعت اچھی کاغذ اوسط درجے کا ۔ قیمت عمر ملنے کا پتہ وقار انبالوی مزنگ لاہور

اردو زبان میں اب تک زیادہ تر بزمیہ نظموں کا چرچا تھا ۔ رزمیہ نظمیں لکھنے کی طرف ہمارے شعرا کی توجہ بالکل نہ تھی یا بہت کم تھی اور یہ اثر تھا اس پستی اور اضمحلال کا جو صدہا برس سے ہندوستان پر طاری تھی ۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کچھ کچھ زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور ہر ملک میں دو ایک شاعر ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو رزمیہ نظمیں لکھنے کی طرف خاص توجہ کر رہے ہیں چنانچہ بنگال میں قاضی نذر الاسلام نے رزمیہ نظمیں لکھنے میں خاص کامیابی حاصل کی ہے اور ان کی شہرت بنگال کی حدود سے گزر کر تمام ہندوستان میں پھیل رہی ہے اردو میں جناب وقار انبالوی نے اس طرف توجہ کی زیرِ نظر مجموعہ اُن کی اسی قسم کی نظموں کا ہے ۔ رزمیہ نظمیں لکھنا آسان کام نہیں ہے اس کے لئے مردانہ جذبات و خیالات کے ساتھ الفاظ بھی پرشکوہ ہونے چاہئیں اور مصرعوں کی در و بست اور ترتیب بھی ایسی کہ سننے والے یا پڑھنے والے پر مردانگی و شجاعت کے وہی

جذبات پیدا ہو جائیں جو شعر کہتے وقت شاعر کے دل و دماغ میں موجزن تھے ۔ وقار صاحب کی یہ ابتدائی کوشش ہے تاہم انھیں اپنے مقصد میں خاصی کامیابی ہوئی ہے اگر انھوں نے مشق جاری رکھی تو کیا عجب ہے کہ ہندوستان کی ترقی کی کوششوں میں اُن کی نظمیں تیز رفتاری اور ہندوستانیوں کے دلوں میں شجاعت و شہامت کا وہ جذبہ پیدا کر دیں جس کی انھیں سخت ضرورت ہے

اس مجموعے میں کل تیرہ نظمیں ہیں ۔ جنگ ۔ سپاہی کا معبد، سپاہی اپنے بچپن میں ۔ سپاہی کا خواب ۔ میدان جنگ میں صبح وغیرہ ۔ شروع میں جناب برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کا پرمغز دیباچہ ہے جس میں انھوں نے ان نظموں کی خصوصیات بیان کی ہیں ۔ کتاب مجلد ہے ۔ جلد پر سنہرے حرفوں میں کتاب اور مصنف کا نام چھپا ہے ۔

مصطفیٰ کمال پاشا ۔ از جناب سید اشفاق حسین صاحب ایم اے ۔ تقطیع چھوٹی ۔ ضخامت ۱۳۲ صفحات ۔ کتابت و طباعت اور کاغذ بہتر قیمت عہ ملنے کا پتہ شیران اسلام بک ڈپو منگلور ضلع سہارنپور ۔

جناب سید اشفاق حسین صاحب بچوں کے لئے شیران اسلام کے عنوان سے نامور مجاہدین و شاہان اسلام کی سوانحعمریاں مرتب کر رہے ہیں یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے اس میں انھوں نے آتا ترک غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے حالات شرح و بسط سے بیان کئے ہیں اسی سلسلے میں ترکی کے موجودہ انقلاب کی تاریخ بھی آگئی ہے ۔ کتاب کا انداز بیان بچوں کے لئے بہت مناسب ہے ۔ زبان آسان اور دلچسپ ہے ۔ البتہ کہیں کہیں خطابت زیادہ پیدا ہو گئی ہے ۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پر سنہرے حرفوں میں کتاب اور مصنف کا نام ہے ۔

رسائل

طلوع اسلام ۔ ایڈیٹر سید نذیر نیازی تقطیع رسالہ جامعہ کی ۔ ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ اچھا کتابت

وطباعت اوسط درجے کی۔ قیمت سالانہ صہ ر فی پرچہ ۸ ر مقام اشاعت قرولباغ ۔ دہلی ۔

جناب سید نذیر نیازی صاحب بی اے جامعہ (سابق استاد جامعہ) کے ادارت و اہتمام میں گذشتہ اکتوبر سے نکل رہا ہے ۔ یہ ایک خالص اسلامی مجلہ ہے اور اس کے تمام عنوانات اسلامی مباحث پر مشتمل ہیں ۔ فاضل مرتب نے پورے رسالے کو چند ابواب میں تقسیم کر دیا ہے شروع میں رسالہ کا تہدیہ ڈاکٹر اقبال کے نام کیا ہے ۔ اس کے بعد شذرات ہیں ان میں نیازی صاحب نے اپنے خاص انداز میں رواں واقعات پر بحث کی ہے اس کے بعد حضرت علامہ اقبال مدظلہ کی ایک تازہ ترین نظم مدنیت اسلام ہے ۔ اس کے بعد مقالات کے ماتحت چار مضامین ہیں ۔ ملت اسلامیہ ہند ۔ ختم نبوت ۔ سیاست معاشی اور اردو ادب کی اسلامی تحریک ۔ اس کے بعد "مسائل حاضرہ" کے ضمن میں شہید گنج کا قضیہ ہے آثار ملیہ کے ذیل میں مسجد شاہ چراغ کا ذکر ہے پھر تاریخ وسیاسیات عالم کا باب ہے اور اُس کے متعدد ذیلی عنوانات ہیں بین الاقوامی دنیا کے تحت حبشی واطالوی نزاع اور جاپان پر دو مختصر مضمون ہیں ۔ بلاد اسلامیہ کے ماتحت ترکی سیاسیات مشرقی ترکستان اور مصر وحبش پر بحث کی گئی ہے ۔ سیاسیات ہند میں اسمبلی کے پچھلے اجلاس ۔ کانگریس کی ذمہ داریوں اور پنجاب کی موجودہ سیاسیات پر اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ رجال و مشاہیر میں مولانا محمد علی اور امیر سعود کا تذکرہ ہے ۔ آثار و مقامات میں نور جہاں بیگم پر ایک مختصر سا مضمون ہے ۔ پھر جہاں گزران کے عنوان سے احمد بے کے ایک ترکی افسانے کا ترجمہ ہے اور "انگریز کیا ہیں" کے عنوان سے ہیرلڈ نکلسن کا ایک مضمون ہے ۔ اسی کے ضمن میں دو دلچسپ کارٹون ہیں ۔ پھر ہمارے معاصرین کے تحت مختلف اخبارات کے اقتباسات ہیں ۔ تنقید کتب کے باب میں شاہ نامۂ اسلام اور خطبات خالدہ ادیب خانم پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔ مراسلات میں لاٹ کے عجز فہم پر راجہ اختر حسن صاحب نے ایک مضمون لکھا ہے آخر میں بزم طلوع اسلام کے تحت علامہ اقبال اور ختم نبوت کے عنوان سے نیازی صاحب کا ایک مختصر مضمون ہے اور سر شاہ سلیمان کے نظریۂ اضافیت پر ایک مضمون کا خلاصہ درج کیا گیا ہے ۔ کوئی شبہ نہیں کہ پرچہ نہایت محنت

اور سلیقے کے ساتھ ایک خاص اسکیم کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور ہر طرح حوصلہ افزائی کا مستحق ہے اگر نیازی صاحب کی توجہ اور کوشش اسی طرح جاری رہی تو یقین ہو کہ رسالہ سنجیدہ طبقے میں بہت جلد مقبولیت حاصل کرلے گا۔

ندیم - بہار نمبر - مرتبہ جناب انجم گیاوی - سائز ۲۰×۳۰ حجم ساڑھے تین سو صفحات - لکھائی چھپائی اور کاغذ بہتر - قیمت بہار نمبر عہ - سالانہ للعہ، نمونے کا پرچہ ۶ر مقام اشاعت دفتر ندیم پنچایتی اکھاڑہ - گیا -

اس رسالے نے حسب معمول اب کے بھی اپنا سالانہ نمبر بہار نمبر کے نام سے نکالا ہے اس اس اشاعت خاص میں امتیازی چیز یہ ہوتی ہے کہ تمام مضامین صرف فرزندان بہار کے فراہم کئے جاتے ہیں - اس پرچے میں بھی یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مضمون نگاروں میں علامہ سید سلیمان ندوی - ڈاکٹر عظیم الدین صاحب - سید ریاست علی صاحب ندوی جناب فکر ایم - اے پروفسر محمد طاہر رضوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی - پروفسر عبدالمنان صاحب ایم - اے پروفسر محمد مسلم صاحب - مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی - حاجی معین الدین صاحب ندوی - مولانا ابوظفر صاحب ندوی - جناب مان پوری - شعراء میں مولانا آزاد عظیم آبادی - شفق رضوی عماد پوری جناب ولی - جناب عرش گیاوی - جناب اصغر مجیبی - جناب جمیل مظہری جناب نجم ندوی وغیرہم قابل ذکر ہیں - مضامین میں مولا سید سلیمان ندوی کا مضمون اہل بہار کے نام ایک پیام کی حیثیت رکھتا ہے - اس کے علاوہ سید غلام حسین مصنف سیر المتاخرین - اردو نثر کی ارتقاء میں اہل بہار کا حصہ بہار میں مسلمانوں کی آمد - ظہور اسلام سے قبل عرب و ایرانی تعلقات - ایک مغل شہزادہ بہار میں - ہماری قدیم قومی و وطنی تہذیب - بہار کی صحافت - خان بہادر خدا بخش خاں - بہار کے معدنی وسائل اعلیٰ درجے کے تاریخی و علمی مضامین ہیں نظموں اور افسانوں کا معیار بھی اچھا خاصا ہے - تین مزاحیہ مضامین بھی ہیں سرورق کے علاوہ جو سہ رنگا ہے پانچ آرٹ کی تصویریں بھی ہیں یہ بھی دو بہاری

مصوروں کے موئے قلم کا نتیجہ ہیں اور نہایت کامیاب ہیں جی نے خواجہ حافظ کے ایک شعر کو مصور کیا ہے اور فن کا کمال دکھایا ہے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ بنن جی پورے دیوان حافظ کو مصور کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بائیس تصویریں رسالے کے مضمون نگاروں کی ہیں۔ سرورق بھی نہایت خوشنما ہے۔ غرض یہ نمبر ہر حیثیت سے کامیاب ہے اور ہم اس کامیابی پر جناب انجم اور ادارۂ ندیم کو مبارکباد دیتے ہیں۔ البتہ اگر جناب وصی بلگرامی کا مضمون شائع نہ ہوتا تو اچھا تھا گڑے مردے اکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں خصوصاً جبکہ اس سے دوسروں کی دل آزاری کا بھی خطرہ ہو۔

ادب - ایڈیٹر جناب ناصر لکھنوی۔ سائز جامعہ کا۔ ضخامت ۶۶ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہتر۔ قیمت سالانہ للعہ فی پرچہ ۵ر مقام اشاعت لکھنؤ۔

کئی سال ہوئے اسی نام کا ایک ادبی ماہ نامہ لکھنؤ سے بہت اہتمام سے نکلا تھا لیکن لکھنؤ کی آب و ہوا اسے زیادہ دنوں تک راس نہیں آئی تھی اور کچھ عرصے کے بعد بند ہو گیا تھا۔ اب بعض باہمت کارکنوں نے اسے دوبارہ جاری کیا ہے اور یہ اطمینان و یقین دلایا ہے کہ اب اس کے بند ہونے کا امکان نہیں ہے۔ اس رسالے کا مقصد پہلے بھی خالص ادبی تھا اور اب بھی انہی مقاصد کے ماتحت جاری ہوا ہے۔ چنانچہ زیر نظر نمبر میں گیارہ نظمیں اور غزلیں ہیں۔ نثر کے مضمون کل سات ہیں ان میں سے بھی بیشتر کا موضوع شعر و شاعری ہے۔ ایڈیٹر صاحب نے نظموں غزلوں اور مضامین کی فراہمی۔ انتخاب اور ترتیب میں نہایت خوش ذوقی اور سلیقے سے کام لیا ہے اگر کارکنان ادب اسی محنت و سلیقے سے اسے ترتیب دیتے رہے تو یہ شعر و ادب کی مفید خدمات انجام دے گا۔

کوثر - ایڈیٹر جناب محمود صاحب مارسٹن۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ ضخامت ۴۲ صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اچھا قیمت مقامی عہ ر اور بیرون بنگلور عہ فی پرچہ ا ر

بنگلور میں اردو جاننے والوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے لیکن یہ کس قدر افسوس کی بات تھی کہ سوائے الکلام روزانہ و ہفتہ وار کے کوئی ادبی رسالہ وہاں سے شائع نہیں ہوتا تھا محمود صاحب نے یہ بڑا کام کیا ہے کہ لوگوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے لئے ایسا عمدہ اور ایسا ارزاں پرچہ نکال دیا رسالے کا معیار بھی کافی بلند ہے۔ مضمون نگاروں میں مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا تمکین کاظمی۔ مولانا محوی صدیقی لکھنوی۔ سید احمد اللہ صاحب قادری ایڈیٹر تاریخ کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ رسالے کی ترتیب اور کتابت وطباعت میں بھی خاص سلیقے اور نفاست سے کام لیا گیا ہے باوجود ان خوبیوں کے قیمت برائے نام ہے اسی لئے ہمیں امید ہے کہ رسالہ بہت جلد مقبولیت حاصل کرلے گا۔

کلیم۔ مدیر مسئول جناب شمیم خاں صاحب شاہ پوری۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ حجم ۴۰ صفحات۔ کتابت وطباعت بہتر۔ کاغذ معمولی۔ قیمت سالانہ مع محصول ے/ فی پرچہ ۴/ مقام اشاعت الہ آباد۔

یہ رسالہ بھی علمی وادبی مقاصد کے تحت "الہ آباد کی نرم و شاداب زمین میں نصب کیا گیا ہے" مضامین اچھے خاصے ہیں مضمون نگاروں میں مولانا نیاز فتحپوری، ڈاکٹر تاراچند۔ مولانا کیفی چڑیاکوٹی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک خاص جدت یہ کی گئی ہے اور یہ اس لئے کہ "خریدار کے پاس دو چار کتابیں فراہم ہوجائیں۔ کوئی خاص عنوان اُسی وقت تبدیل ہوگا جبکہ اس کی تکمیل بصورت کتاب ہوجائے۔ تکمیل کے بعد کتاب سے متعلق سرورق بھی شائع ہوا کرے گا۔

ساربان۔ ایڈیٹر غلام محمد خاں بی اے سائز ۲۰×۳۰/۸ کاغذ اور کتابت وطباعت بہتر۔ چندہ سالانہ ے/ فی پرچہ ۴/ مقام اشاعت آسٹریلیا بلڈنگ۔ لاہور

اس رسالے کا مقصد جناب مرتب کے الفاظ میں یہ ہے کہ "واقعات عالم اور مختلف سیاسی معاشرتی اور اقتصادی تحریکات کو اس رنگ میں پیش کیا جائے کہ پبلک میں ان کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کی عادت پیدا ہو"

اُردو زبان میں رسالوں کی بہتات ہے اور نئے نئے رسائل مختلف مقاصد کے ماتحت برابر نکل رہے ہیں لیکن اب تک سوائے مرحوم "صبح امید" کے کوئی ایسا رسالہ نہیں نکلا تھا جو تمام تر سیاسی معاشرتی اور اقتصادی مباحث پر مشتمل ہو۔ صبح امید بھی اعتدال پسند سیاستدانوں کا ترجمان تھا۔ اُس کے مضامین بھی عام دلچسپی کے نہیں ہوتے تھے۔ رسالہ ساربان اس اہم ضرورت کو پورا کرسکتا ہے اگر وہ اپنے مقصد پر سختی سے قائم رہے اور عام رو میں نہ بہہ جائے۔ اس وقت اس امر کی شدید احتیاج ہے کہ ہندوستان کے عام لوگوں کو اہم سیاسی مسائل کی تعلیم دیجائے اور ماہرین سیاست سے آسان زبان اور سہل اندازِ بیان میں مضامین لکھوائے جائیں۔ ساربان کے زیرِ نظر نمبر میں جو جلد کا پہلا نمبر ہے اکثر مضامین سیاسی مباحث پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ہندوستانی باشندوں سے خطاب۔ جدید اصطلاحات پر سرسری نظر۔ کانگرس اور وزارتیں۔ ہندوستان کا پروپگنڈا دوسرے ملکوں میں۔ فلپائن کی تحریک آزادی۔ قضیہ اٹلی و ابی سینیا وغیرہ ان کے علاوہ جو مضامین ہیں وہ بھی عمرانی، اقتصادی اور اصلاحی ہیں۔ تنقید و تبصرے کے ماتحت رواں واقعات پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ غرض بحیثیت مجموعی رسالہ نہایت مفید اور ہر طرح حوصلہ افزائی کا مستحق ہے

انیس - ایڈیٹر جناب شرار بی اے۔ سائز جامعہ کا لکھائی چھپائی اوسط درجے کی۔ کاغذ معمولی۔ حجم ۶۴ صفحے قیمت سالانہ عہ طالب علموں سے صرف دو روپئے۔ مقام اشاعت: ایلچ پور سٹی۔ برار

یہ رسالہ ایلچ پور برار سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے اس کا آٹھواں نمبر ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب رسالے کی ترتیب اور مضامین کی فراہمی میں بہت محنت اور توجہ سے کام لیتے ہیں، اس نمبر میں علاوہ مقامی مضمون نگاروں کے جناب رشید صدیقی صاحب علیگڑھ جناب اسرائیل احمد خاں صاحب اور حضرت جوش ملیح آبادی کے نام بھی ہیں۔ اس نواح میں اب تک کوئی معقول رسالہ نہ تھا شرار صاحب نے انیس نکال کر اُردو زبان کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

دُنیا کی رفتار

چین، جاپان اور دول مغرب | شخصیت انفرادی کی طرح شخصیت قومی بھی اپنے بقا و نمو کے لئے قوت کی محتاج ہوتی ہے۔ اور جب یہ قوت نہیں رہتی تو اس کے اجزاء ترکیبی میں انحطاط اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ان چیزوں کی طرح جن کے عمل میں کسی مرکزی ارادہ کی کار فرمائی نہیں ہوتی اور دوسروں کا آلہ کار بن کر رہ جاتی ہیں، تلاطم مقاصد میں ایک بے مقصد بے شعور تنکا!

یہی وجہ تو ہے کہ آج چین کا مسئلہ حبش کی طرح دراصل ان شکاریوں میں باہمی سمجھوتہ یا تکرار کا مسئلہ ہے جو اسے اپنے کام میں لانا چاہتے ہیں۔ یعنی چین کا مسئلہ روس اور جاپان کا مسئلہ ہے، انگلستان اور جاپان کا مسئلہ ہے، اگر نہیں ہے تو چین کا مسئلہ نہیں ہے!

قدیم تاریخ کے دُھرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ ۱۹۲۲ء سے دول مغرب اور امریکہ نے "چین کے مسئلے" کو یوں طے کر رکھا تھا کہ چین کی خود مختاری کی ضمانت ہونی چاہئے، اور بحرالکاہل میں قوتوں کا ایک ایسا توازن قائم کرنا چاہئے کہ کسی کا پلہ بھاری نہ ہو اور بحری قوت میں ایک مقررہ تناسب کو سب تسلیم کر لیں، خصوصاً جاپان امریکہ اور برطانیہ کے بیڑوں کی قوت میں ایک خاص تناسب مقرر کر دیا جائے۔ ۱۹۳۱ء تک مسئلہ کا یہ حل کارگر ثابت ہوا لیکن ۱۹۳۱ء کے نصف آخر میں جاپان نے اس سیاست کا آغاز کیا جس سے اس 'حل' کی ساری کائنات دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئی۔ چین کی خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا اور اسی کے ساتھ بحرالکاہل میں توازن قوی کا۔ اب دول مغرب اگر اس مسئلہ کا کوئی حل سوچنا چاہیں تو انھیں جاپان سے معاملہ کرنا ہوگا۔ کہ اب چین کا مسئلہ دراصل جاپان کا مسئلہ ہے۔

چین کا علاقہ چھین کر جاپان نے اپنی قیادت میں منچوکو کی ریاست قائم کر دی جس کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ مشرق بعید میں روسی اثر کو ایک ضرب کاری لگی۔ روس کی مشرقی توسیع کے مقابلے

میں ہی جاپان کی ابھرتی ہوئی قوت نے ترقی کی تھی اور آج یہ ترقی اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ اس نے روسی توسیع کو تقریباً بند کر دیا ہے اور تیس برس سے جس ریل کا معاملہ روس اور جاپان کے تعلقات کو کشیدہ بنائے ہوئے تھا یعنی مشرقی چینی ریلوے اسے اب روس نے جاپان کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے اس میں شک نہیں کہ اب بھی بہت سے مسائل ہیں جن پر روس اور جاپان میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس ریل کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد ان دونوں میں جنگ کے امکانات بہت کم ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ جاپان کو اس علاقے میں غیر معمولی تقویت حاصل ہو گئی ہے چین میں تسلط قائم کر کے اس نے روس کو اپنے مقابلے میں کمزور کر دیا ہے اور روس سے کشیدگی کو کم کر کے اپنے مقابلے میں روسی چین کا سہارا ابھی بہت کچھ چھین لیا ہے۔

منچوکو کے قیام سے ایک بات یہ اور پیدا ہو گئی کہ چین کے مقابلے میں جاپان کو ایک بڑی محاذ بھی حاصل ہو گیا ہے۔ آئندہ چین کے شمال میں بھی جاپانی قوت موجود ہوگی اور اگر جاپانی اثر اندر یہ علاقہ منگولیا تک پھیل گیا تو روس چین سے بالکل جدا ہو جائے گا۔ غرض جاپان نے اپنی سیاست اور اپنی فوجی اور بحری قوت سے چین میں اپنے قدم ایسے جما لئے ہیں کہ مغربی قوتوں کو اگر چین میں تجارت کرنی ہو یا اپنا سرمایہ لگانا ہو تو جاپان کی رضامندی کا حاصل کرنا لازمی ہے۔ جاپان کے ظلم پر چین میں یقینی غصہ ہے لیکن پھر بھی یہ دونوں قومیں ایشیائی ہیں، بے شمار تمدنی رشتے انھیں باہم ملائے ہوئے ہیں اور جاپان کا یہ حوصلہ کہ وہ اس سارے علاقے کا قائد ہو جائے ایسا ہے جس کے پورا ہونے میں اب دول مغرب زیادہ عرصہ تک حائل نہیں ہو سکتیں۔ خود چینی بھی شاید مغربی تسلط پر جاپانی تسلط ہی کو ترجیح دیں گے۔

چنانچہ جاپان نے اب صاف صاف اس بات کا اعلان بھی کرنا شروع کر دیا ہے کہ کوئی مغربی قوت چین میں معاشی یا سیاسی اثر جمانے کی فکر ہماری مرضی بغیر نہ کرے۔ ۱۹۳۴ء میں جب جمعیۃ اقوام کے ماہرینِ مغربی اور وسطی چین میں بہت سی معاشی تجاویز پر غور کر رہے تھے تو جاپان نے اس پر سخت ناخوشی کا اظہار کیا۔ اور اس کے اخباروں نے صاف صاف لکھا کہ جاپان چین میں برطانیہ

اور امریکہ کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے تعاون پر تیار نہیں ۔ انھیں پہلے جاپان کی قیادت کو تسلیم کرنا ہوگا۔

اور جاپانیوں کا یہ دعویٰ محض شیخی ہی شیخی نہیں ہے۔ وہ اس کی تدبیر بھی کر رہے ہیں۔ اور کامیابی سے کر رہے ہیں، انھوں نے چین کی طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھایا ہے اور تمام صوبوں میں ایسی حکومت قائم کرنے کی تدبیریں کی ہیں جو جاپان کو ہر طرح کی معاشی اور سیاسی مراعات دینے پر مجبور ہوں اور اتنی مضبوط نہ ہوں کہ جاپان کی قوت کا مقابلہ کر سکیں۔ وہ چین میں مرکزی حکومت کو کمزور کر کے صوبوں کی حکومتوں کو اپنے اثر میں لینا چاہتا ہے۔ یہی اس نے شمالی جاپان میں کیا ہے۔ فی الحال تو وہ شمالی اور وسطی چین میں اسی قسم کا بالواسطہ تسلط چاہتا ہے۔ "فی الحال" ہم نے دانستہ لکھا ہے ممکن ہے کہ اگر اس تدبیر سے جاپانی اغراض پوری طرح حاصل نہ ہوسکیں تو بلاواسطہ تسلط کا مسئلہ بھی سامنے آئے۔

چین کے شمالی صوبوں میں جاپان کی یہ تدبیر بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔ جنوبی چین میں جاپان کا اثر کم ہے لیکن پھر بھی فارموسا کے بالمقابل فوکین میں اس کے قدم جمے ہوئے ہیں۔ کینٹن اور کوانگسی کے جنوبی صوبوں میں بھی اس کے کارندے مصروف ہیں اور ضرورت پڑے تو چیانگ کائی شک کی قوت کو بہت کچھ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان سب باتوں سے چین میں اس قدر غصہ اور ناراضی ہوگی کہ یہ تدبیریں زیادہ عرصے تک کامیاب نہ ہوسکیں گی وہ غالباً حقائق سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ چین میں تعلیم یافتہ طبقے کا بہت بڑا حصہ جاپانی اثر میں ہے۔ ان لوگوں نے جاپانی مدارس میں پڑھا ہے، جاپانی بے تکلفی سے بولتے ہیں اور جنھیں جاپان کے اثر بڑھنے سے شخصی فوائد کی توقع ہے۔ ان لوگوں سے جاپان کو بڑی مدد ملی ہے اور امریکہ اور مغربی ممالک میں پڑھے ہوئے لوگوں کا اثر انھوں نے بہت کچھ کم کر دیا ہے۔ اور آج بھی باوجود جاپان کی ظالمانہ سیاست کے پہلے سے بہت زیادہ تعداد چینی نوجوانوں کی جاپانی مدارس میں جا رہی ہے اور جاپان ان کے لئے ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچا رہا ہے اور اس

بات کے قرائن نہایت قوی ہیں کہ جاپان اکثر چینی صوبوں میں اپنے موافق حکومتیں قائم کرا سکے گا۔ اور اندرونی سیاست پر اس اثر کے باعث چان کائی شک پر ایسا دباؤ ڈال سکے گا کہ وہ کسی طرح ہاتھ سے نہ نکل سکے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ خود چان کائی شک کی تعلیم بھی جاپانی ہی ہے!

چنانچہ اس دباؤ نے ۱۹۳۴ء میں چین کے نظام محاصل کو بدلوا کر جاپان کے موافق کرلیا۔ اس سے یہ بھی ہوسکتا ہے آئندہ چینی محاصل کی نگرانی پر ایک برطانوی افسر کی جگہ کوئی جاپانی مامور ہو۔ اس سے یہ کام لیا جاسکتا ہے اور غالباً لیا جائے گا کہ برطانیہ اور امریکہ اور دوسری مغربی قوموں کو چین معاشی مراعات دینے سے انکار کرے۔

اس صورت حال کو انگریزوں نے سب سے پہلے سمجھا ہے اور وہ اگر ایک طرف جاپان کے مقابلے کے لئے اپنی قوت کے بڑھانے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں تو دوسری طرف چین میں اپنے موجودہ سرمایہ کی حفاظت اور اپنی موجودہ تجارت کے قیام کے لئے جاپان سے سمجھوتے کی فکر میں بھی ہیں۔ انگلستان کا نہایت با اثر سیاسی پرچہ راونڈ ٹیبل اپنی ستمبر کی اشاعت میں لکھتا ہے " جاپان کے مقابلے میں اس وقت جو بھی بحری اور بری انتظامات کرنے ہوں اس میں شک نہیں کہ مسئلہ چین کا کوئی مستقل حل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہماری عام سیاست سے یہ نتیجہ نہ نکل پائے کہ بحر الکاہل کے علاقے میں ہم جاپان سے ان مشکلات کے باب میں جو ہمارے اور جاپان کے تعلقات کو برابر کشیدہ کرتی رہتی ہیں کوئی مفاہمت کرلیں۔"

دنیا کی یہ سب سے قوی سلطنت جاپان سے کیوں مفاہمت چاہتی ہے؟ اس لئے کہ جیسا ہم نے اوپر بتلایا جاپان نے اپنی سیاست سے چین کو بالکل اپنا دست نگر بنا لیا ہے اور برطانیہ نے اس ملک میں مدتوں کی کوشش سے اپنی تجارت قائم کی ہے اور سرمایہ لگایا ہے۔ چین میں اس وقت سالانہ کوئی ۲۰ کروڑ روپیہ کا انگریزی مال جاتا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ کوئی ڈھائی ارب روپیہ سے بھی زیادہ انگریزی سرمایہ چین میں لگا ہوا ہے۔ چین کی موجودہ معاشی

حالت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں اشیاء صرف کی کھپت ایک عرصے تک نہ بڑھ سکے گی۔ لیکن اشیاء دولت آفریں کی مانگ زیادہ ہوگی۔ یعنی سرمایہ لگانے کے امکانات اور بڑھیں گے لیکن ایسا کرنے میں جاپان سے تصادم ہوگا۔ جاپان کسی دوسرے ملک سے چین میں سرمایہ کی درآمد کو اس لئے شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے کہ غالباً یہ معاشی اثر اس کے خلاف کام میں لایا جائیگا۔ چنانچہ جاپان کوشش کر رہا ہے کہ چین کو سب سرمایہ خود ہی فراہم کرے۔ اور یہاں تک اس میں ساعی ہے کہ خود دوسرے ملکوں سے سرمایہ حاصل کر کے اسے چین میں لگا رہا ہے، لیکن دوسروں کو براہ راست وہاں سرمایہ نہیں لگانے دیتا۔ جاپان کے پاس خود بھی تو غیر محدود سرمایہ نہیں ہے۔

اس حقیقت پر انگریز شاطران سیاست جاپان سے سمجھوتے کی نبا رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ راونڈ ٹیبل جو ان معاملات میں سب سے بہتر معلومات رکھنے والا جریدہ ہے، لکھتا ہے:۔

" جاپان کو خود جلد یا دیر میں پردیسی سرمایہ درکار ہوگا۔ اپنی بڑھتی ہوئی تجارت خارجہ کو مالی مدد پہنچانے کے لئے اسے سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ منچوریا کے لئے سرمایہ چاہئے اور جوں جوں چین کے وسائل پر اس کا انحصار پڑے گا تو ان کو ترقی دینے کے لئے بھی سرمایہ مطلوب ہوگا۔

پھر جب دنیا کی دوسری منڈیوں میں اس کے مال کی کھپت آخری منزل تک ترقی کر چکے گی تو یہ چین ہی میں اپنی صنعتی پیداوار کے لئے منڈی تلاش کرے گا اور اس کے لئے چینی معیشت کو ترقی دینے کی ضرورت ہوگی اور یہ اسی طرح ممکن ہو کہ چین میں سرمایہ لگایا جائے۔ لہذا آخر کار چین میں ہمارے اور جاپان کے مقاصد میں اختلاف کی جگہ یک جہتی ہی پائی جائے گی۔

اسلئے ۱۹۳۵ء کے لئے چین میں ہمارا مقصد صاف صاف یہ ہونا چاہئے کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ چینی تعاون اور مناسب تحفظ کے ساتھ ساتھ مغربی سرمایہ بھی جاپان کی مدد اور رضامندی سے چین کے وسائل کو ترقی دینے میں کام آئے۔ . . جاپان کی چین میں دوہری حیثیت ہے۔ ایشیا کے قائد کی اور کاروبار میں شریک کی۔ ہمارا فائدہ اس میں ہے کہ اس کی دوسری حیثیت کو تقویت پہنچائیں، جہاں تک حفاظت سے ایسا ممکن ہو اپنے تجارتی اغراض کو جاپان کے تجارتی اغراض سے

مطابق کریں اور اسے یقین دلائیں کہ خود اس کے لئے سب سے بہتر سیاست یہی ہے کہ وہ شنگھائی کے عظیم الشان تجارتی عمارت میں مغرب کو اپنا ساتھی بنائے اور چینیوں کی اپنے ملک کو ترقی دینے میں مدد کرے۔"

قوموں اور ملکوں کی تقسیم پر کس سکون اور اطمینان قلب کے ساتھ اظہار خیال ممکن ہے!؟

ایک چینی اخبار سے اقتباس | اس سلسلے میں تین سین کے ایک مشہور چینی اخبار آئی شی پاؤ سے ذیل کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

"کئی سال سے جاپان اور برطانیہ کے تعلقات کچھ مذبذب سے ہیں اور ظاہر تو یہ ہو رہا ہے کہ مخالفت کے اسباب موافقت کے امکانات سے زیادہ ہیں۔ لیکن یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ طرفین اس صورت حال سے مطمئن نہیں ہیں۔ چنانچہ جاپان کے وزیر خارجہ نے اس اہم مسئلہ پر خاص توجہ شروع کر دی ہے لندن کے جاپانی سفیر مسٹر تسودیرا کو جاپان بلایا گیا ہے تاکہ ان کی مدد سے تعلقات میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کی مستقل تدبیر نکالی جائے لندن میں جو جاپانی مشیر تجارتی رہتا ہے وہ بھی ٹوکیو بلایا گیا ہے۔ اور خیال ہے کہ ان کوششوں میں اچھی کامیابی ہوگی۔

سر لیتھ راس جو چین تشریف لائے ہیں کہ یہاں کے معاشی حالات کا مطالعہ فرمائیں، ان کی تشریف آوری بھی دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ براہ راست چین تشریف لائے نہ راہ میں امریکہ میں قیام فرمایا گئے تو دو ہفتے کے لئے جاپان گئے تاکہ وہاں عہدیداروں اور ساہوکاروں سے ان خیالات پر مبادلہ خیال کر سکیں جن میں انگلستان اور جاپان کے اغراض مشترک ہیں۔

برطانیہ کی اس کوشش کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ مشرق بعید میں اپنی تجارت اور اپنی نوآبادیوں کی حفاظت چاہتا ہے اور خصوصاً شمالی چین میں اپنے معاشی اور تجارتی مفاد کو محفوظ کرنے کی فکر میں ہے۔ اور اس کے لئے جاپان ہی سے صلاح و مشورہ ضروری ہے۔ اصلی سوال

یہ ہے کہ جاپان برطانیہ سے کیا مانگتا ہے اور آیا برطانیہ اس مطالبے کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں ؟"

پھر ٹوکیو کے مراسلات اور اخباروں کے مضامین سے اقتباسات دے کر یہ جریدہ اپنا خیال ظاہر کرتا ہے کہ جاپان برطانیہ سے یہ مطالبہ کرے گا کہ وہ مشرقی ایشیا میں جاپان کی مخصوص حیثیت کو باضابطہ تسلیم کرے۔ اور وہاں اپنے مفاد کی بیچ بس اس حد تک کرے جہاں تک کہ جاپانی تعاون کے ساتھ ممکن ہو۔ مزید براں مشرقی ایشیا کی منڈیوں کو دوسری قوموں کے لئے کھلا رکھنے کے معاوضے میں جاپان برطانیہ سے یہ چاہے گا کہ جاپانیوں کو برطانوی نوآبادیوں میں ہجرت کرکے جانے کا اور اس کے تجارتی مال کو ان کی منڈیوں میں مقابلے کا حق حاصل ہو۔

اس جریدہ کے خیال میں انگلستان پہلے مطالبے کو مان لے گا۔ اس لئے کہ انگلستان کی سیاست کی بنا حقائق پر ہے اور واقعات کا تقاضا یہی ہے کہ اسے مانا جائے کوئی اور چارہ ہی نہیں۔ جاپان کو جو حیثیت حاصل ہے وہ تو حاصل ہے ہی، کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن دوسرے مطالبے کی نوعیت اور ہے۔ اس باب میں برطانیہ کی نوآبادیاں اس کو روکیں گی اور خود اس کے معاشی اغراض اسے تسلیم کرنے سے باز رکھیں گے۔ جاپانی۔ برطانی تعلقات کو استوار کرنے میں یہی دشواری ہے اور اسی وجہ سے اس باب میں زیادہ امیدیں نہیں باندھی جاسکتیں لیکن اگر فرض کیجئے کہ یہ سمجھوتہ ہو گیا تو بھی اس کے معنی چینی نقطۂ نظر سے یہ ہوں گے کہ شمالی چین پر معاشی تسلط میں جاپان کے ساتھ اور بھی شریک ہو جائیں گے اور اس کا اقتدار بلا شرکت غیرے نہ ہوگا۔ مگر اس سے چین کو فائدہ ؟"

اپنے نوشتۂ تقدیر کو بھی آدمی کس سکون و رضا سے پڑھ سکتا ہے ؟!

جبش اور جمعیۂ اقوام | جمعیۂ اقوام نے اپنے قیام کے بعد پہلی مرتبہ سیاست کی حقیقی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی تھی، اور ہر چند کہ اٹلی کے مقابلے میں برطانیہ کی انصاف پسندی کے محرکات باطنی دنیا کی نظروں سے بالکل چھپے ہوئے نہ تھے مگر پھر بھی تعجب تھا کہ انگلستان کی قیادت میں

یہ جمعیتہ (جس کے متعلق کہنے والے نے سچ کہا تھا کہ بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند) محض حبش کی حمایت کے لئے نہیں بلکہ حق وانصاف کی تائید میں اپنے ایک بااثر رکن اٹلی کی ناخوشی مول لینے کو تیار ہو گئی۔ پہلی مرتبہ غاصب کو غاصب بتایا گیا اور اس کے غصب کو روکنے کی تدابیر بھی ہوئیں۔ مگر افسوس کہ انصاف دوستی اور حق پسندی کا یہ تجربہ زیادہ دن نہ چل سکا۔ اور یہ توقع کہ دنیا کی قومیں اس جمعیتہ کے ذریعہ آئندہ قومی ظلم کا انسداد کر سکیں گی۔ بظاہر عرصے کے لئے ختم ہو گئی۔ اور جیسا کہ ہم نے ان صفحات میں پہلے چند بار لکھا تھا۔ فرانس نے اٹلی کی نئی دوستی کا حق ادا کیا اور انگلستان کو بھی اس پر آمادہ کر لیا کہ ایسے شرائط صلح پیش کئے جائیں جو اٹلی کے لئے قابل قبول ہوں۔ ان سطور کو لکھتے وقت ان برطانوی فرانسیسی تجاویز کے متعلق نہ جمعیتہ نے کوئی فیصلہ کیا ہے نہ اٹلی نے۔ مگر فیصلہ کچھ ہو یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ انگلستان جس نے حبش کی حمایت میں دنیا کی اخلاقی رہنمائی کا کام اپنے سر لیا تھا اس بار گراں کی زیادہ تاب نہ لا سکا اور آخر کو فرانس کے مشورے سے جو تجاویز اس نے پیش کیں وہ ایسی ہیں کہ ان سے پھر لاٹھی والے کی بھینس کے اصول کی تصدیق ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اطالوی اخبارات کا یہ طعن کارگر ہوا کہ ہزار چوہے کھا کر بلی کا حج کو جانا کچھ بھلا نہیں معلوم ہوتا۔

اور سچ یہ ہے کہ اس وقت حبش کی کمزوری اور اٹلی کی سینہ زوری کی وجہ سے دنیا کی رائے عامہ اٹلی کے کس قدر بھی خلاف ہو لیکن جمعیتہ اقوام اس وقت تک اس رائے عامہ سے پورا کام نہیں لے سکے گی جب تک کہ ماضی کی سیاسی اور معاشی ناانصافیوں اور حق تلفیوں کو رفع کرنے کی کوئی صورت نہ نکلے۔ اور جب کہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ پہلے ان کے تلف شدہ حق پورے ہوں گے جن میں قوت ہے۔ کمزور کے حقوق کے احترام کی منزل تو بہت دور ہے کون جانتا ہے کہ انسان کی ہمدردی اسے اس منزل تک کب پہنچنے دے گی۔ ہاں، قوت والوں کو ان کا حق ملنے کا وقت قریب ہے۔ اور شاید انگلستان نے اپنی جدید تجاویز میں اٹلی کا بھی حق تسلیم کیا ہے!

انگلستان کے مشہور لبرل سیاس سر ہربرٹ سیمول نے نومبر کے — NINETEENTH CENTURY

میں جمعیۃ اقوام کے مستقبل پر ایک مضمون میں با وجود اٹلی کے غاصبانہ اقدام کی مذمت کرنے کے مسئلے کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے مفکرین سیاسی کے ذہن میں پہلی گھڑی سے یہ بات کم وبیش موجود تھی کہ اخلاقی اصولوں سے جہاں تک کام نکل سکے نکالو مگر سیاسی قوتوں کی بنیادی تقسیم کو بھی نظر انداز نہ کرو۔ اٹلی کو دباؤ۔ دب جائے تو اچھا ہے نہ دبے تو خود دب جاؤ۔

سر ہربرٹ لکھتے ہیں: " کرۂ ارض میں خشکی کا رقبہ کوئی ۵۵ ملین میل مربع ہے اس میں سے ۱۳ ½ ملین سلطنت برطانیہ کے زیر نگیں ہے۔ ۸ ½ ملین روس کے، ۴ ½ ملین فرانسیسی سلطنت کے ۳ ¾ ملین ریاستہائے متحدہ امریکہ کے، ۴ ¼ ملین چین کے پاس ہے (بشمول منچوریا!) یعنی ان پانچ دول کے پاس ۵۵ میں سے ۳۴ ملین مربع میل ہیں۔ یعنی کل کا ۳/۵۔ بلجیم، ہالینڈ اور پرتگال کی نوآبادیوں میں ۲ ½ ملین مربع میل اور چلے جاتے ہیں اور یوں دنیا کا ۲/۳ ان دول کے پاس آجاتا ہے۔"

"دول اس صورت حال سے غیر مطمئن ہیں وہ کہتی ہیں کہ جو یورپی ریاستیں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مضبوط تھیں اور جنھوں نے اپنے مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا وہ نہایت آسانی سے یہ کہہ سکتی ہیں کہ بیسویں صدی کا حال مختلف ہے، جمعیۃ اقوام کے قیام سے ایک نئے نظام کا آغاز ہوتا ہے اور توسیع ملکی کا عہد ختم ہو چکا تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کا نقشہ اتفاق سے جو ۱۹۲۰ء میں تھا وہ ہمیشہ کے لئے ویسا ہی رہے گا۔ سو سال بعد بھی وہی اور ۵۰۰ سال بعد بھی وہی؟" یہ دول یہ بھی کہتی ہیں کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ لوگ جن کے پاس دنیا کا دو تہائی ہے اپنی پیداوار کے مبادلے کو اپنی ہی حدود کے اندر رکھنے کی کس طرح کوشش کر رہے ہیں۔ آپ ہمارے آدمیوں کو ہجرت کر کے اپنے ملک میں بسنے بھی نہیں دیتے پھر آخر ہمارے ۹۰ ملین جاپانی، ۷۰ ملین جرمن، ۴۰ ملین اطالوی اور ۳۰ ملین پول کیسے جئیں اور بنپیں؟" اس مسئلہ کے حل کے لئے ملکوں کے رقبے کو گھٹانے بڑھانے کی تدبیر پر بحث کر کے سر ہربرٹ اسے تقریباً بالکل

ناقابل عمل بتاتے ہیں کہ "حبش جیسے غیر ترقی یافتہ ملک کا رقبہ چھیننے تک کے لئے بھی ایک غاصبانہ جنگ کی ضرورت ہو" نوآبادیوں کو جمعیتہ اقوام کے سپرد کردینے کا بھی امکان نہیں۔ سر ہربرٹ کے نزدیک حل یہ ہے کہ بجائے سیاسی اور ملکی حل کے معاشی حل کی صورت نکالی جائے۔ اس لئے کہ مسئلہ دراصل " کافی غذا اور صنعت کے لئے کافی خام اجناس کا مسئلہ ہے۔ تاکہ سب ملکوں کی آبادی یہی نہیں کہ زندہ رہ سکے بلکہ ترقی بھی کرسکے .... دنیا اس وقت غذا اور اجناس خام سے پٹی پڑی ہے اور ان کی رسد میں اضافہ کے امکانات تو بے اندازہ ہیں۔ مشکل بس یہ ہے کہ کوئی کسی کو غذا اور اجناس خام بھیج نہیں دیتا جب تک اس کی قیمت ادا نہ کی جائے۔ اور ان کی قیمت زر رائج میں ادا نہیں کیجاسکتی جب تک کہ زر رائج کی مقدار اتنی نہ بڑھادی جائے کہ اس اضافہ کی وجہ سے وہ بالکل بے قدر ہو جائے۔ صاف بات یہ ہے کہ ان کی قیمت اگر ادا ہوسکتی ہے تو دوسری اجناس سے یا خدمات سے، اور معاشی قومیت کے مسلک نے اجناس اور خدمات کے ادھر سے اُدھر جانے پر جان بوجھ کر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے۔ اور نتیجہ بھی بالکل صاف ہے یعنی ہماری کوشش کا خاص مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ان پابندیوں کو ہٹایا یا یہ نہیں تو کم تو ضرور کیا جائے"۔

جب تک دنیا اور جمعیتہ اقوام سر ہربرٹ کے مشورے پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہوں اٹلی تو " ناانصافی " کو مٹانے کے لئے ناانصافی اور ظلم ہی کے پرانے نسخے کا استعمال کر رہا ہے اور اسے اس سے روکنے والے بھی " ناانصافیوں " کے وجود کو تسلیم کرکے اس نسخے کے استعمال کی مخالفت سے رفتہ رفتہ دست کش ہی ہوتے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا رحم کرے۔